دسمبر 1988ء

تعلیم و تربیت
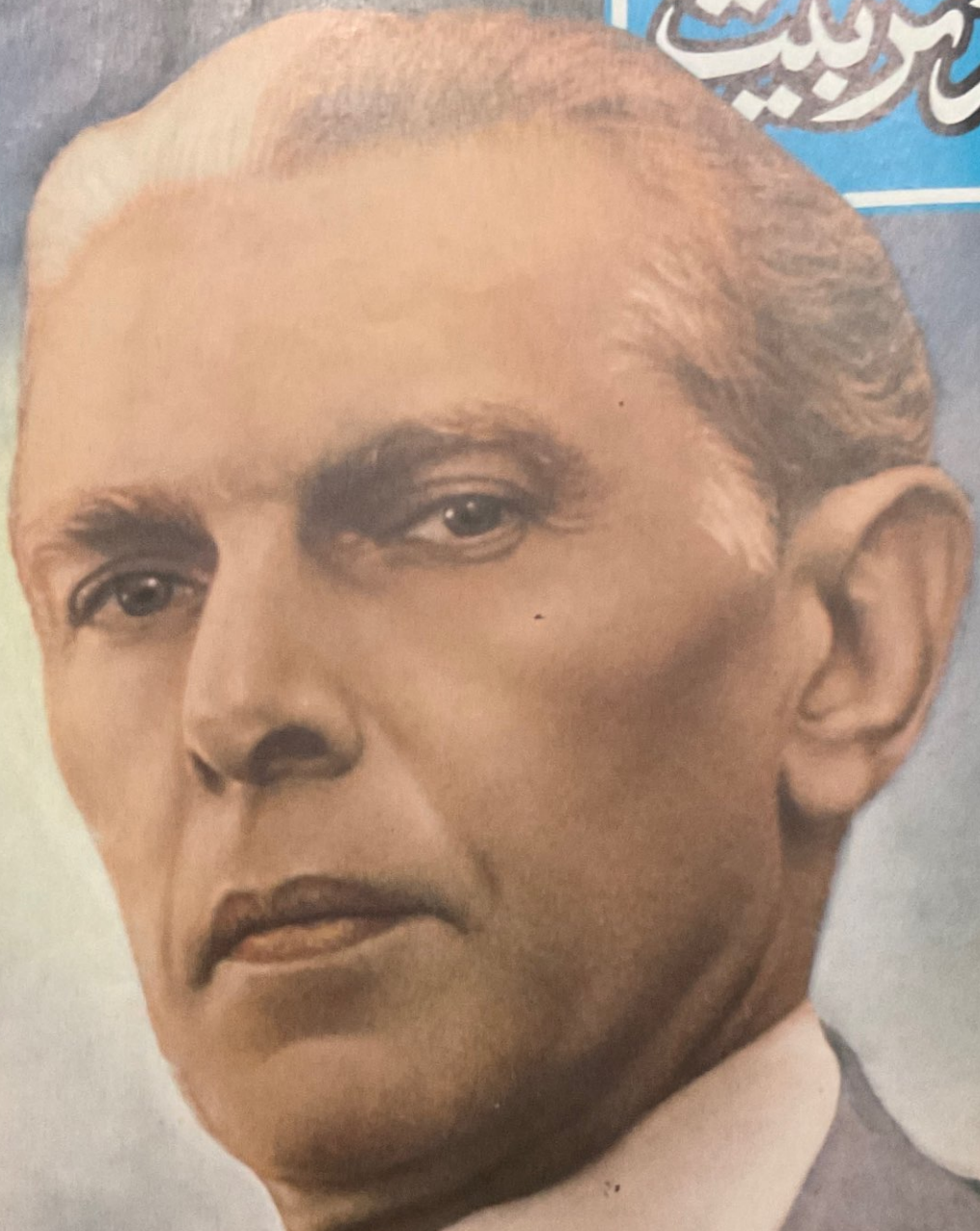
یں آپ کو مصروفِ عمل ہونے کی تاکید کرتا ہوں۔

کام ، کام اور بس کام

کونِ خاطر ، صبر و برداشت اور انکساری کے ساتھ اپنی قوم کی سچی خدمت کرتے جایئے۔

قائدِ اعظم ؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

السلام علیکم

آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ نئے سال سے تعلیم و تربیت میں ایک اور دل چسپ سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے، "ہونہار مُصوّر"۔ جن بچّوں کو آرٹ سے دل چسپی ہے، وہ دیے گئے موضوع پر خوب صُورت اور رنگین تصویریں بنا کر بھیجیں۔ جو تصویریں ہمارے آرٹ ڈائریکٹر کی نظر میں سب سے اچھی ہوں گی، وہ تعلیم و تربیت میں چھپیں گی اور اُنھیں انعام دیا جائے گا۔

تین مہینوں کے لیے اکٹھے موضوع دیے جا رہے ہیں۔ آپ جس موضوع پر چاہیں تصویر بنا سکتے ہیں:

جنوری: دریا میں کشتی فروری: پہاڑ اور سُورج مارچ: آسمان پر پرندے

تصویر تعلیم و تربیت کے آدھے صفحے کے برابر ہونی چاہیے۔ اُس کے نیچے اپنا نام، عمر، کلاس اور پورا پتا لکھیے اور اپنے سکول کے پرنسپل، ہیڈ ماسٹر یا ہیڈ مسٹریس کا تصدیق نامہ ضرور بھیجیے۔ جنوری میں چھپنے والی تصویروں کے لیے آخری تاریخ 10 دسمبر ہے۔

ایڈیٹر

فہرست مضامین

ماہنامہ
تعلیم و تربیت
پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا
بچوں کا محبوب رسالہ

چیف ایڈیٹر: عبدالسلام
ایڈیٹر: ظہیر سلام
سینئر اسسٹنٹ ایڈیٹرز: سید لخت، مقبول انور داؤدی، ڈاکٹر عبدالرؤف
اسسٹنٹ ایڈیٹر: سیماں علی
آرٹ ڈائریکٹر: محمود حسن رُومی
سرکولیشن منیجر: الطاف احمد
ایڈورٹائزنگ منیجر: مبشر علی خان
ڈسٹری بیوشن منیجر: شہزاد اصغر
اکاؤنٹس منیجر: محمد انور بھٹی
جنرل منیجر پروڈکشن: ایم جاوید خان
منیجر پرنٹنگ: فاروق عالم
سرکولیشن اسسٹنٹ: محمد بشیر راہی

مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور
پبلشر: ظہیر سلام
پرنٹر: عبدالسلام

شعبہ ادارت و اشتہارات
۳۲-شارع بن بادیس (ایمپرس روڈ) لاہور
فون: 63090-226819

سرکولیشن اور اکاؤنٹس
۶۰-شاہراہ قائداعظمؒ لاہور
فون: 301196-97

راولپنڈی آفس
۲۷۷-پشاور روڈ
فون: 63503-64273

کراچی آفس
مہران ہاؤس - مین کلفٹن روڈ
فون: 537730

دسمبر 1988
قیمت فی پرچہ 8/- روپے
سرپرست: قائداعظمؒ

اس کارٹون کا عُنوان لکھیے اور 1000 روپے کے انعامات حاصل کیجیے۔ تین بہترین عُنوانات پر 100 روپے، 75 روپے اور 50 روپے کی کتابیں دی جائیں گی۔ 31 خصوصی انعامات 25، 25 روپے کی کتابوں کے دیے جائیں گے۔ آخری تاریخ 10 دسمبر ہے۔
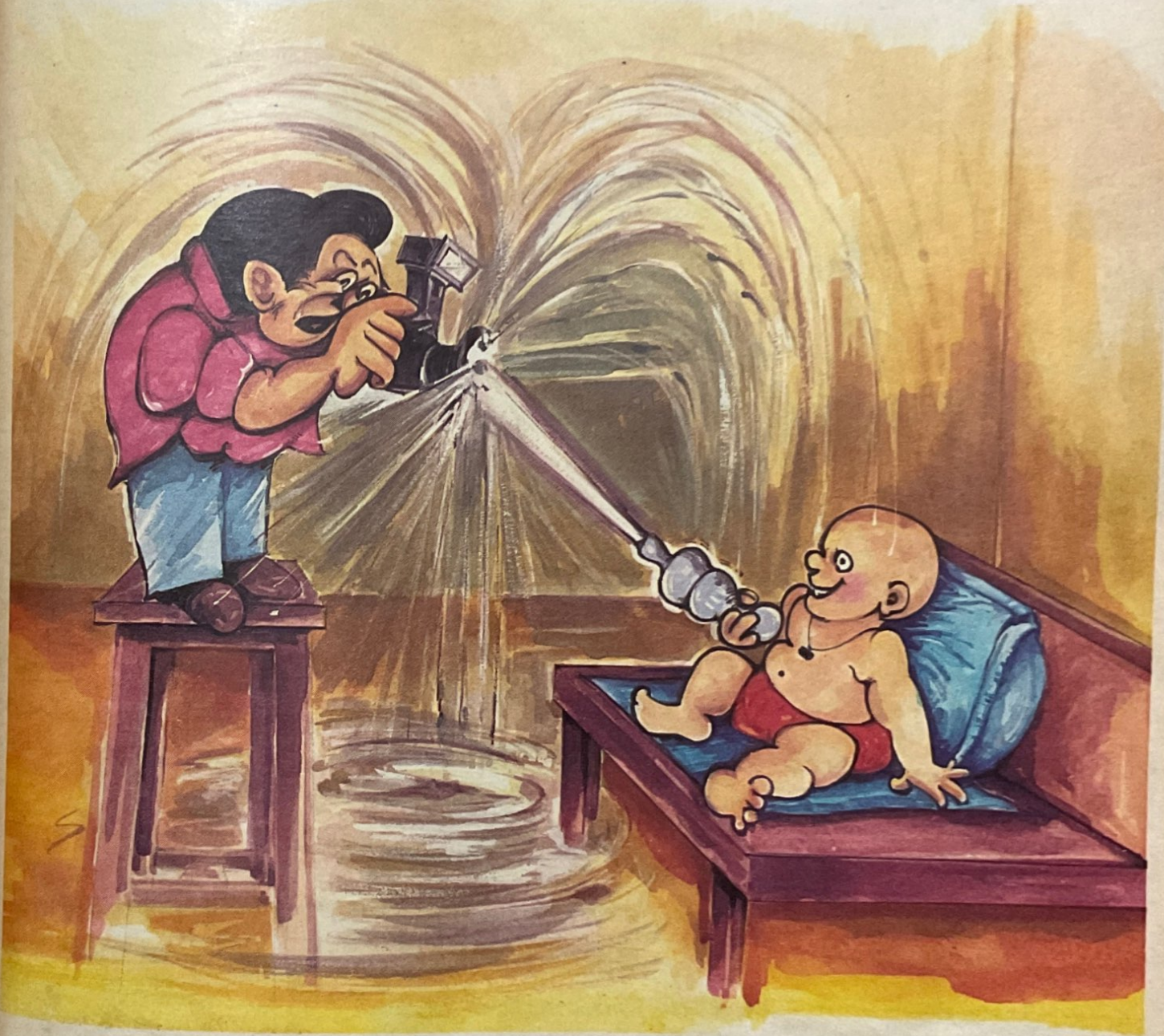
نتیجہ بلاعُنوان نومبر 1988: تقریباً 15 ہزار بچّوں نے 250 عنوان تجویز کیے، جن میں سے صرف دو عنوان حجبل کو پسند آئے (1) ارے! یہ میری وِگ ہے گھاس نہیں۔ (2) او ہو! تم نے تو میرا راز فاش کر دیا۔ پہلا عنوان اِن بچّوں نے تجویز کیا ہے۔ سارہ زمان گوجرانوالہ کینٹ۔ علی اعجاز لاہور۔ ضیاءاللہ فاران سوسائٹی کراچی۔ موسیٰ ہارون چوبرجی پارک لاہور۔ فرحان احمد ماڈل ٹاؤن لاہور۔ اسد رفیع۔ راولپنڈی کینٹ۔ شازیہ اصغر فیروزوالا۔ محمد شاہد فیروز گوجرانوالہ۔ محمد طارق ایّوب گوجرانوالہ۔ عمران اسلم شادمان کالونی لاہور۔ مونا زیدی صدر بازار لاہور کینٹ۔ واصف عدیل میانوالی۔ جنید احمد (مکمل پتا نہیں لکھا) سعد اللہ احمد سرائے عالمگیر۔ بابر رضوان سیالکوٹ۔ سعدیہ فیصل فیصل آباد۔ محمد عتیق الرحمٰن اسلام آباد۔

دُوسرا عنوان ان بچّوں نے تجویز کیا۔ ایاز قیصر ماڈل ٹاؤن لاہور۔ عمران جاوید کامونکی۔ عظمیٰ مجید ریواز گارڈن لاہور۔ صوفیہ امین گلبرگ 3 لاہور۔ عائشہ رشی راولپنڈی۔ مدثر سعید مغل پُورہ لاہور۔ رابعہ امجد نیو کیمپس لاہور۔ آمنہ مفتی وحدت کالونی لاہور۔ محمد سلیم شاہد میاں چنوں۔ عائشہ خلیق ٹاؤن شِپ لاہور۔ ناہید میر جہلم۔ محمد علی رضا عباسی بہاول پُور۔ نعمان حامد میر لاہور کینٹ۔ معین الحق خان ڈیرہ اسمٰعیل خان۔ مدثر نصیر پھلرواں۔ طیفور حسن لاہور کینٹ۔ جاوید اقبال نشتر روڈ لاہور۔ حسیب اسلم جیل روڈ لاہور۔

انھیں 28، 28 روپے کی کتابیں دی گئی ہیں۔

تین چور ایک بیوقُوف

بُہت دِن ہُوئے، کسی گاؤں میں ایک کِسان رہتا تھا۔ اِتنا سیدھا اور بھولا کہ بچّے بھی اُسے بے وقُوف بنا لیتے تھے۔ نام تو کچھ اور تھا لیکن لوگ بھولے میاں کہتے تھے۔ اُس کے پاس تھوڑی سی زمین تھی، ایک گدھا تھا اور ایک بکری۔ زمین سے بس اِتنی ہی پیداوار ہوتی تھی کہ کسان اور اُس کی بیوی سال بھر روٹی کھا لیتے تھے۔ گدھا کھیت سے اناج اور جنگل سے لکڑیاں لانے کے کام آتا تھا اور بکری کا دونوں میاں بیوی دُودھ پیتے تھے۔ بچّہ کوئی نہ تھا۔ اِس حال میں بھی وہ خوش تھے اور جیسی تنگی تُرشی سے گُزر بسر ہو رہی تھی، اُسی پر راضی تھے۔ کبھی کسی نے اُن کے مُنھ سے شِکایت کا کوئی لفظ نہ سُنا تھا۔

ایک سال کسان کے کھیت میں اناج کم پیدا ہُوا۔ اُس نے سوچا کہ بکری کو فروخت کر دیا جائے۔ اِس سے جو پیسے ملیں گے، اُن سے غلّہ خرید لُوں گا۔ چُناں چہ ایک دِن صُبح کو اُس کی بیوی نے چار موٹے موٹے پراٹھے پکائے۔ اُن پر سرسوں کا ساگ رکھا اور پوٹلی میں باندھ کر میاں کو دے دیا۔

وہ قصبہ جہاں مہینے میں ایک بار جانوروں کی منڈی لگتی تھی، کسان کے گاؤں سے کافی دُور تھا اور وہاں پہنچنے میں ایک دِن لگتا تھا۔ سردیوں کے دن تھے اور چُوں کہ کسان کو ایک رات قصبے میں گزارنی تھی، اُس نے لحاف اور گدا بھی ساتھ لے لیا۔ اُس نے یہ سب سامان گدھے پر لادا، بکری کی رسّی گدھے کی دُم سے باندھی اور بکری کی دُم میں گھنٹی باندھ دی۔

اُن دِنوں بسیں نہیں تھیں۔ لوگ پیدل یا گدھے گھوڑوں پر سفر کرتے تھے۔ آبادی بھی اِتنی نہیں تھی جتنی آج کل ہے۔ راستے سُنسان اور ویران ہوتے تھے اور اکثر اکیلے دُکیلے مُسافروں کو چور اُچکّے لُوٹ لیتے تھے۔ کسان نے بکری کی دُم میں گھنٹی اِس لیے باندھی تھی کہ اُس کی ٹن ٹن سے معلُوم ہوتا رہے کہ وہ پیچھے پیچھے آ رہی ہے۔ کوئی چور اُچکا اُسے کھول کر نہیں لے گیا۔ جب وہ گاؤں سے نکل کر ایک ویران جگہ پر پہنچا تو وہاں ایک جھاڑی میں تین چور چُھپے بیٹھے تھے۔ اُنھوں نے کسان کو دیکھا تو اُن کی باچھیں کِھل گئیں۔

ایک چور بولا "بکری میری ——"

دُوسرا بولا "گدھا میرا ——"

اب رہ گیا تیسرا چور۔ وہ بولا "اور میرے لیے کیا بچا؟ اِس کے پُرانے دُھرانے کپڑے؟ خیر چلو۔ مَیں یہی لے لُوں گا۔ بالکُل نہ ہونے سے، کچھ ہونا بہتر ہے۔"

کِسان جھاڑی کے پاس سے گُزر کر آگے بڑھا تو ایک چور چُپکے سے باہر نِکلا۔ اُس نے بکری کی گھنٹی گدھے کی دُم میں باندھی اور بکری کھول کر لے اُڑا۔

گدھا دُم ہلاتا چل رہا تھا اور گھنٹی ٹن ٹن بج رہی تھی۔ کسان کو اطمینان تھا کہ بکری پیچھے پیچھے آرہی ہے۔ تھوڑی دُور آگے جاکر اُس نے یُوں ہی پیچھے مڑکر دیکھا تو دِل دھک سے رہ گیا۔ بکری غائب تھی اور اُس کی گھنٹی گدھے کی دُم میں بندھی ہُوئی تھی! اُس نے چیخنا چلّانا شُروع کردیا:

"ارے لوگو! دوڑو! مَیں تباہ ہوگیا! برباد ہوگیا!"

اُسی وقت ایک آدمی بھاگتا ہُوا اُس کے پاس آیا۔ یہ دُوسرا چور تھا۔ اُس نے پُوچھا "کیا ہُوا بڑے میاں؟ کیوں چلّا رہے ہو؟"

"ہائے میری بکری! ہائے میری بکری! کوئی اُچکّا اُسے چُرا کر لے گیا۔" کِسان نے سر پر دوہتّڑ مار کر کہا۔

چور بولا "اچھا، تو وہ تمھاری بکری تھی۔ ابھی ابھی ایک آدمی اُسے گھسیٹتا ہُوا درختوں کے اُس جھُنڈ کی طرف گیا ہے۔ دوڑ کر جاؤ۔ زیادہ دُور نہیں گیا ہوگا۔"

"خُدا تمھارا بھلا کرے، میاں" کسان نے کہا "تُم ذرا میرے گدھے کا خیال رکھنا۔ میں ابھی اُس اُچکّے سے اپنی بکری لے کر آتا ہُوں۔"

یہ کہ کر اُس نے درختوں کے جھُنڈ کی طرف دوڑ لگادی، جو وہاں سے آدھے مِیل کے فاصلے پر تھا۔ لیکن جب وہ ہانپتا کانپتا درختوں کے پاس پہنچا تو وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ بلکہ دُور دُور تک آدمی نظر نہ آتا تھا۔ وہ روتا پیٹتا واپس آیا تو اُس پر دُوسری بجلی گری۔ اُس کا گدھا بھی غائب تھا!

اب تو اُس کی حالت دیکھنے کے قابل تھی۔ کبھی زور زور سے چیختا چلّاتا، کبھی سینہ کُوٹتا اور کبھی سر کے بال نوچنے لگتا۔ اُس کی بکری جاچکی تھی، گدھا جاچکا تھا اور گدھے کے ساتھ ایک لحاف، ایک گدّا اور چار پراٹھے بھی چور لے گیا تھا۔ اب وہ قصبے جاکر کیا کرتا۔ ناچار گھر کی طرف واپس چلا۔ ابھی کُچھ ہی دُور گیا ہوگا کہ کِسی کے رونے کی آواز آئی۔ اِدھر اُدھر دیکھا تو ایک طرف کُنواں نظر آیا، جس کی مُنڈیر سے ٹیک لگائے ایک آدمی بیٹھا زار و قطار رو رہا تھا۔ یہ تیسرا چور تھا۔ کِسان اُس کے پاس گیا اور بولا:

"بھائی، مُصیبت تو مُجھ پر پڑی ہے۔ تُم کیوں رو رہے ہو؟"

چور نے کہا "ہائے! کیا بتاؤں۔ کِس کو اپنی درد بھری داستان سُناؤں۔ میں دُنیا کا سب سے بدقِسمت اِنسان ہُوں۔"

کِسان بولا "بھائی، دُنیا کا سب سے بدنصیب آدمی تو میں ہُوں۔ وہ ظالِم میری بکری لے گئے، گدھا لے گئے اور گدھے کے ساتھ لحاف، گدّا اور پراٹھے بھی لے گئے۔ تم کیسے کہتے ہو کہ تم دُنیا کے سب سے بدقسمت انسان ہو؟"

چور نے کہا "بڑے میاں، میرا حال سُننے کے لیے فولاد کا کلیجا چاہیے۔"

"کُچھ بتاؤ تو سہی" کسان بولا "شاید میں تمھاری کُچھ مدد کرسکوں۔ ویسے تو مَیں خُود مدد کا محتاج ہُوں۔"

چور نے کہا "میں قصبے کی منڈی میں گھوڑا بیچ کر گھر جارہا تھا۔ روپوں کی تھیلی میرے ہاتھ میں تھی۔ یہاں پہنچا تو یہ کنُواں نظر آیا۔ پیاس لگی تھی۔ پانی نکالنے

کے لیے جھکا تو تھیلی کنوئیں میں گر گئی۔ ہائے! میں مر گیا۔ ہائے! میں لُٹ گیا۔

کِسان بولا ”تو میاں، تم کنوئیں میں سے تھیلی نکال کیوں نہیں لیتے؟“

چور بولا ”مجھے پانی سے ڈر لگتا ہے۔ میں کنوئیں کے اندر نہیں جا سکتا۔ ہائے! کیا کروں! تھیلی میں پُورے اڑھائی سو روپے ہیں۔ اگر کوئی اللہ کا بندہ تھیلی نکال کر مجھے دے دے تو پچاس رُوپے اُسے دے دُوں گا۔“

”پچاس رُوپے!“ کِسان نے سوچا ”اِتنے پیسوں سے تو میں ایک گدھا اور ایک بکری خرید سکتا ہُوں۔ اور ہاں، لحاف اور گدّے کے عِلاوہ غلّہ بھی لے سکتا ہُوں۔“ اُس نے چور سے پُوچھا ”میاں بھائی، کیا تم سچ کہ رہے ہو؟“

چور بولا ”ارے بڑے میاں۔ آپ میری بات کا یقین کریں۔ میں ایک عزّت دار آدمی ہُوں۔“

کِسان نے کہا ”ٹھیک ہے۔ مُجھے کنوئیں میں اُترنے کا کافی تجربہ ہے۔ اپنے گاؤں کے کُنوئیں کی صفائی میں ہی کرتا ہُوں۔ تم مجھے پچاس روپے دو گے نا؟“

چور جھلّا کر بولا ”بڑے میاں، آپ نے بھی حد کر دی۔ اب کیا میں مسجد میں چل کر قسم کھاؤں؟“

کِسان نے کہا ”نہیں، نہیں۔ اِس کی کوئی ضرُورت نہیں۔ مجھے تمُھاری بات کا یقین ہے۔ میں ابھی تمھاری تھیلی نِکالے دیتا ہوں۔ لیکن کپڑوں سمیت اندر گیا تو یہ بھیگ جائیں گے اور اِنھیں سکھانے میں کافی دیر لگے گی۔ میں انھیں اُتار کر یہیں رکھے دیتا ہُوں۔ تم اِن کا دھیان رکھنا۔ ایسا نہ ہو وہ کم بخت چور اِنھیں بھی اُٹھا کر لے جائیں۔“

”اِن کی فِکر نہ کرو،“ چور نے کہا ”اِن کی تو میں ایسی حفاظت کروں گا کہ آپ کی سات پُشتیں یاد رکھیں گی۔“

کِسان نے کپڑے اُتار کر مُنڈیر کے پاس رکھ دیے اور خود کُنوئیں میں اُتر گیا۔ اُس نے کُنوئیں کا چپّا چپّا چھان مارا۔ ریت میں ہاتھ ڈال ڈال کر ٹٹولا مگر تھیلی ہوتی تو مِلتی۔ ایک گھنٹے کی محنت کے بعد بے چارہ تھک ہار کر اُوپر آیا تو اُس پر تیسری بجلی گری۔ وہ آدمی غائب تھا اور اُس کے ساتھ کسان کے کپڑے بھی غائب تھے! خوش قِسمتی سے، کُچھ دیر بعد، اُسی کے گاؤں کا ایک آدمی اُدھر سے گُزرا۔ اُس نے بڑے میاں کو اپنی چادر دی اور وہ چادر جسم پر لپیٹ کر گاؤں واپس آیا۔

گاؤں والوں نے بڑے میاں کی داستان سُنی تو ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ اُنھوں نے کہا ”تم دُنیا کے سب سے بد قسمت اِنسان تو شاید نہ ہو، البتہ سب سے بے وقوف اِنسان ضرور ہو۔“ پھر سارے گاؤں نے چندہ کر کے بڑے میاں کو پچیّس رُوپے دیے۔ جس سے اُنھوں نے ایک گدھا، ایک بکری اور کچھ اناج خرید لیا۔ (س۔ل)

ہاتھی میرا ساتھی

لیفٹیننٹ کرنل جے۔ ایچ ولیمز
سعید لخت

اس کہانی کا مُصنّف (انگریز فوجی افسر) لیفٹیننٹ کرنل جے۔ ایچ۔ ولیمز بیس سال برما کے جنگلوں میں رہا ہے، جہاں وہ ہاتھیوں کو سَدھایا کرتا تھا۔ برما بنگلہ دیش کا پڑوسی مُلک ہے اور یہاں کے جنگلوں میں لکڑی ڈھونے کا کام ہاتھیوں سے لیا جاتا ہے۔ ولیمز نے اِس کہانی میں ہاتھیوں کی عادات اور رہن سہن کے بارے میں بڑی دِل چسپ باتیں بتائی ہیں (س۔ل)

برما کے جنگل عمارتی لکڑی کے لیے بہت مشہور ہیں۔ اِن جنگلوں کی لکڑی بُہت مضبوط اور پائیدار ہوتی ہے، اِس لیے دُنیا بھر میں اِس کی مانگ ہے۔ جنگلوں کا زیادہ تر حصّہ پہاڑی اور دُشوار گزار ہے۔ یہاں ٹرک اور لاریاں نہیں چل سکتیں۔ اِن کی جگہ ہاتھی استعمال کیے جاتے ہیں۔ لکڑہارے درخت کاٹ کر گِرا دیتے ہیں۔ اور اِن کٹے ہُوئے درختوں کو ہاتھی کھینچ کر دریا کے کنارے لے جاتے ہیں، جہاں اُنھیں دریا میں ڈال دیا جاتا ہے۔ دریا اُنھیں بہا کر اُس شہر تک لے جاتا ہے جہاں لکڑی چِیرنے کے کارخانے ہیں۔

جب مجھے برما کے جنگلوں کی نگرانی کا کام سونپا گیا تو اِن جنگلوں کی حالت بڑی خراب تھی۔ لکڑہارے دِل لگا کر کام نہیں کرتے تھے اور ہاتھیوں کی بھی مناسب دیکھ بھال نہیں کی جاتی تھی، جِس کی وجہ سے لکڑی کی پیداوار پر بُرا اثر پڑ رہا تھا۔ میں نے اپنے عُہدے کا چارج لیتے ہی مہاوتوں یعنی ہاتھی بانوں کی حالت سُدھاری اور اُن کے دِل میں کام کرنے کی لگن پیدا کی۔ برمی زبان میں ہاتھی بان کو اُوزی کہا جاتا ہے۔ اُوزی ہاتھیوں کے درمیان پل بڑھ کر جوان ہوتے ہیں اور وہی جانتے ہیں کہ اِس دیو جیسے جانور سے کیسے کام لیا جا سکتا ہے۔ جنگلوں میں صبح کو، سورج نِکلتے ہی کام شروع ہو جاتا ہے اور دوپہر تک جاری رہتا ہے۔ دوپہر کو اُوزی ہاتھیوں کو جنگل میں چھوڑ دیتے ہیں تاکہ وہ آزادی سے گھومیں پھریں اور کھائیں پیئیں۔ دُوسرے دِن صُبح کو، سُورج نِکلنے سے پہلے، اُوزی اپنے اپنے ہاتھیوں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے ہیں اور اُنھیں ہانک کر کیمپ میں لے آتے ہیں۔

اُوزی اپنے ہاتھی کے قدموں کے نشان پہچانتا ہے اور اِنھی نشانات پر چلتا ہُوا ہاتھی تک پہنچتا ہے۔ ہر ہاتھی کی گردن میں گھنٹی بندھی ہوتی ہے اور اِن گھنٹیوں کی آوازیں الگ الگ ہوتی ہیں۔ گھنٹی کی آواز سُن کر اُوزی سمجھ جاتا ہے کہ اُس کا ہاتھی کِس طرف ہے۔ بعض ہاتھی بڑے ضِدّی ہوتے ہیں اور اُنھیں لانے کے لیے اُوزیوں کو بڑے جتن کرنے پڑتے ہیں۔ کیمپ میں آ کر اُوزی پہلے ناشتا کرتا ہے، پھر ہاتھی کو تالاب میں نہلاتا ہے اور اِس کے بعد اُس کی پیٹھ پر کاٹھی کَستا ہے، جس کا مطلب ہوتا ہے کہ اب کام شروع ہو گیا ہے۔ وہ ہاتھی کی گردن پر بیٹھ کر اُسے اُس جگہ لے جاتا ہے جہاں لکڑہارے لکڑیاں کاٹ رہے ہوتے ہیں۔ یہاں وہ ہاتھی کو بِٹھا کر نیچے اُترتا ہے، کٹے ہُوئے درخت کے تنے میں سُوراخ کر کے اُس میں زنجیر ڈالتا ہے اور پھر یہ زنجیر ہاتھی کی کاٹھی سے باندھ دی جاتی ہے۔

اُوزی ہاتھی کی گردن پر بیٹھ کر اُسے پَیروں سے ہانکتا ہے اور ہاتھی لکڑی کو گھسیٹ کر دریا کے کنارے لے جاتا ہے۔ یہاں اُوزی نیچے اُتر کر لکڑی میں سے زنجیر نکال دیتا ہے اور ہاتھی لکڑی کو دھکا دے کر دریا میں گرا دیتا ہے۔ ہاتھی کی عمر تقریباً انسان کی عمر کے برابر ہوتی ہے، اور دونوں ایک ہی عُمر میں جوان ہوتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جس دن کسی اُوزی کے ہاں بچّہ پیدا ہُوا اُسی دن اُس کی ہتھنی نے بھی بچّہ دیا۔ دونوں بچّے ایک ساتھ پل بڑھ کر جوان ہوتے ہیں اور بڑھاپے تک ایک دُوسرے کے دوست رہتے ہیں۔

جنگلی ہاتھیوں کے کسی غول میں کوئی ہتھنی بچّہ دیتی ہے تو وہ کسی ہتھنی کو اپنی سہیلی بنا لیتی ہے۔ اِس ہتھنی کو بچّے کی چچی کہتے ہیں۔ ماں اور چچی مِل کر بچّے کی حفاظت کرتی ہیں پھر بھی 100 میں سے 25 بچّے شیر کھا جاتے ہیں۔ قُدرت نے ہتھنی کو اپنے بچّے کی حفاظت کی یہ ترکیب سُجھائی ہے تو شیر کو بھی اُسے شکار کرنے کی ترکیب سکھا دی ہے۔ شیر سیدھا بچّے پر حملہ نہیں کرتا، کیوں کہ اِس طرح بچّے کی ماں اور چچی اُسے سُونڈ میں جکڑ کر یا پَیروں تلے روند کر مار ڈالیں گے۔ وہ پہلے ماں پر حملہ کرتا ہے اور اُس کی پیٹھ پر چڑھ کر اِس بُری طرح اُس کی کھال اُدھیڑتا ہے کہ وہ بدحواس ہو کر بھاگ کھڑی ہوتی ہے۔ ماں کو بھگا کر شیر چچی کا بھی یہی حشر کرتا ہے، اور جب وہ بھی بھاگ جاتی ہے تو بچّے کو اُٹھا کر لے جاتا ہے۔

ہتھنی اپنے بچّے کے پاس کسی کو نہیں آنے دیتی۔ ایک دفعہ میں یہ بے وقوفی کر بیٹھا تھا اور بس خدا نے ہی بچا لیا۔ نہیں تو میری ہڈی پسلی ایک ہو جاتی۔ ہُوا یُوں کہ ہمارے کیمپ کی ایک ہتھنی نے ایک بچّہ دیا۔ میں نے جا کر اُسے مبارک باد دی اور پھر بچّے کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔ ننھا شطونگڑا خدا جانے کیا سمجھا کہ ایک دم چیخنے چلّانے لگا۔ ہتھنی نے غصّے سے بھر کر میری طرف سُونڈ بڑھائی، اور اگر میں پھرتی سے پیچھے نہ ہٹ جاتا تو اُس کی لپیٹ میں آ ہی گیا تھا۔

ہمارے کیمپ میں ایک بڑا شاندار ہاتھی تھا، جس کا نام پوبان تھا۔ ایک دن اچانک وُہ پاگل ہو گیا۔ اُس نے پہلے اپنے اُوزی کی ہڈّیوں کا سُرمہ بنایا اور پھر دو ہتھنیوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ اِس کے بعد تو اُس کی یہ حالت ہوئی کہ جو جاندار سامنے آتا، اُس پر حملہ کر دیتا۔ ہم نے اُس پر قابو پانے کی بُہت کوشش کی مگر وہ بچ کر جنگل میں نکل گیا۔ دُوسرے دن معلوم ہُوا کہ اِس پاگل ہاتھی نے گاؤں میں گُھس کر کئی دیہاتیوں کو زخمی کر دیا ہے۔ میں نے اعلان کیا کہ جو شخص پوبان کو پکڑ کر لائے گا اُسے تین سو روپے انعام دیا جائے گا۔ اِس اعلان کے دو دن بعد چند لوگوں نے مجھے بتایا کہ پوبان بانسوں کے جنگل میں گھوم رہا ہے۔ میں نے اپنے خدمت گار لڑکے "کیا بسین" کو ساتھ لیا اور پوبان کی تلاش میں نکل کھڑا ہُوا۔ میں اُس کی ٹانگ پر گولی مار کر اُسے زخمی کرنا چاہتا تھا، کیوں کہ اِتنے شان دار ہاتھی کو مارتے ہُوئے میرا دل دُکھتا تھا۔ لیکن کیا بسین نے کہا کہ صاحب، اِسے زخمی نہ کیجیے۔ میں اِسے قابو میں کر لُوں گا۔ یہ لڑکا دراصل تین سو روپے لینا چاہتا تھا۔ اُس نے بُہت ضِد کی تو میں نے اجازت دے دی۔ مگر بعد میں مجھے پچھتانا پڑا۔

دُوسرے دن، دوپہر کو، چند لوگوں نے آ کر مجھے اطلاع دی کہ پاگل پوبان نے کیا بسین کو مار ڈالا ہے! مجھے یہ سُن کر بُہت دُکھ ہُوا۔ اُس رات میں نے جنگل میں کُھلی جگہ خیمہ لگایا۔ چاندنی رات تھی۔ چاروں طرف دُودھیا روشنی پھیلی ہُوئی تھی۔ میں کُچھ دیر پوبان کا انتظار کرتا رہا اور پھر سو گیا۔ مُشکل سے ایک گھنٹا گزرا ہو گا کہ کھڑ کھڑ کی پُرشور آواز سے میری آنکھ کُھل گئی۔ ہڑبڑا کر خیمے سے باہر نکلا اور وہاں جو ہولناک منظر دیکھا، اُسے زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔ میرے خیمے سے تھوڑے فاصلے پر پوبان سُونڈ اُٹھائے کھڑا تھا۔ اُس کا مُنھ میری طرف تھا اور ایسا لگتا تھا جیسے وہ ایک ہی وار میں مجھے اور میرے خیمے کو ہوا میں اُچھال دے گا۔ اُس کے اگلے پَیر میں وہ زنجیر بندھی تھی جسے تُڑا کر وہ کیمپ سے بھاگا تھا۔ کھڑ کھڑ کی آواز اِسی زنجیر کی تھی۔

مجھ میں اِتنی ہمت نہ تھی کہ مُڑ کر خیمے میں جاؤں اور رائفل نکال لاؤں۔ اور میرے خیال میں یہ اچھا ہی ہُوا، کیوں کہ میرے پیٹھ موڑتے ہی پوبان حملہ کر دیتا۔ اور پھر خُدا جانے میرا کیا حشر ہوتا۔ چند لمحے ہم دونوں بُت بنے ایک دُوسرے کو گُھورتے رہے، اور پھر وہ نہ جانے کیا سوچ کر ایک طرف کو چل دیا۔ زنجیر کی آواز دیر تک سُنائی دیتی رہی۔

صبح کو لوگوں نے مجھے بتایا کہ پوبان جنگل میں فُلاں جگہ موجود ہے۔ میں بیس جوانوں کو لے کر فوراً وہاں پہنچ گیا۔ چار جوانوں کے پاس چھوٹی چھوٹی بندوقیں تھیں۔ اُنھوں نے پوبان کے پیچھے اور دائیں بائیں ہو کر ہوا میں فائر کیے، جس سے خوف زدہ ہو کر وہ سامنے کی طرف بھاگا۔ یہاں میں ایک چھ فٹ ٹیلے پر بیٹھا اُس کا انتظار کر رہا تھا۔ میری رائفل کی دونوں نالیں بھری ہُوئی تھیں۔

جُوں ہی وہ دوڑتا ہُوا میری طرف بڑھا، میں نے اُس کے اگلے پَیر کا نشانہ لے کر گولی چلادی۔ لیکن بدقسمتی سے گولی اس کے پیر سے چند اِنچ اِدھر ہی زمین میں دھنس گئی۔ رائفل کی آواز سے وہ غضب ناک ہوگیا اور چِنگھاڑتا ہُوا میری جانب لپکا۔

اب میرے لیے اِس کے سِوا کوئی اور چارہ نہ تھا کہ اُس کے سِینے کا نشانہ لوں اور گولی اُس کے دِل میں اُتار دُوں، کیوں کہ رائفل کی ایک ہی نال بھری ہُوئی تھی۔ وہ چیختا چنگھاڑتا لمحہ بہ لمحہ میرے قریب آتا جا رہا تھا۔ آخر جب وہ پچیس گز کے فاصلے پر رہ گیا تو میں نے اُس کے سِینے کا نشانہ لے کر لبلبی دبا دی۔ گولی رائفل کی نال سے نِکلی اور اُس کا سینہ چیرتی ہوئی دل میں اُتر گئی۔ وہ چند سیکنڈ لڑکھڑایا، پھر زور کی جُھرجُھری لی اور دھڑام سے زمین پر گِر کر ٹھنڈا ہوگیا۔ میں نے نفرت سے رائفل زمین پر پھینک دی۔ اِتنے شان دار ہاتھی کو مار کر مجھے دُکھ ہُوا تھا۔ کاش! میں اُسے زِندہ پکڑ سکتا۔

عام طور پر پندرہ بیس سال کی عُمر کے جنگلی ہاتھیوں کو پکڑ کر سدھایا جاتا ہے۔ کیوں کہ اس عُمر میں وہ اُوزی کے اِشاروں کو سمجھنے اور بوجھ ڈھونے کے قابِل ہوجاتے ہیں۔ کیمپ کی سُدھی ہُوئی ہتھنیوں کے بچّوں کے مقابلے میں جنگلی ہاتھیوں کو سُدھانا بہُت کٹھن کام ہے اور اِس کے لیے بڑے صبر اور مہارت کی ضرورت ہے۔ پچّیس سال کی عُمر میں ہاتھی چوبیس پچّیس الفاظ کا مطلب سمجھنے لگتا ہے۔ اُوزی دھت دھت کہتا ہے تو وہ بیٹھ جاتا ہے اور تاہ تاہ کہتا ہے تو کھڑا ہو جاتا ہے۔ بعض ہاتھی بُہت سمجھ دار ہوتے ہیں۔ وہ زمین پر پڑی ہوئی چیزیں اُٹھا کر اپنی گردن پر بیٹھے ہُوئے اُوزی کو دے دیتے ہیں۔ میں نے ایک ایسا ہاتھی دیکھا جو نہ صِرف پائپ بلکہ جلتا ہُوا سگرٹ اُٹھا کر اپنے سوار کو دے دیتا تھا۔

ہاتھیوں کی عقل مندی اور ذہانت کے یُوں تو بُہت سے واقعات میں نے دیکھے ہیں، لیکن اِن میں سے صِرف دو واقعات آپ کو سُناتا ہُوں۔ ایک دفعہ برما کے دارالحکُومت رنگُون میں سرکس آیا تو میں دیکھنے چلا گیا۔ پہلے دُوسرے جانوروں کے تماشے دِکھائے گئے اور پھر ہاتھیوں کی باری آئی۔ چار پانچ گراں ڈِیل ہاتھی جھُومتے جھامتے رِنگ میں داخِل ہُوئے۔ اِن میں سے ایک ہاتھی کھیل میں دِل چسپی نہیں لے رہا تھا۔ وہ رِنگ ماسٹر کے اِشاروں پر توجّہ دینے کے بجائے تماشائیوں کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک اُس نے سُونڈ اُٹھائی، خوشی سے چنگھاڑا اور رِنگ میں سے نِکل کر تماشائیوں کی طرف لپکا۔ تمام لوگ چُپ چاپ، دم سادھے، بیٹھے رہے۔ ہاتھی جھُومتا ہُوا تھرڈ کلاس میں گیا، وہاں سے ایک تماشائی کو سُونڈ میں اُٹھا کر لایا اور سب سے آگے فرسٹ کلاس کے ایک خالی صوفے پر اُسے بٹھا دیا۔ بعد میں مجھے معلوم ہُوا کہ یہ شخص روزانہ دِن کے وقت سرکس میں آتا، ہاتھی کو کیلے کھِلاتا اور دیر تک اُس

سے باتیں کرتا رہتا تھا۔ تقریباً ہر دوسرے تیسرے دن سرکس دیکھنے آتا تھا اور ہمیشہ فرسٹ کلاس میں بیٹھتا تھا۔ اُس دِن شاید اُس کے پاس پیسے کم تھے اس لیے وہ تھرڈ کلاس میں بیٹھ گیا۔ اُس کا دوست ہاتھی بھلا کب یہ گوارا کر سکتا تھا۔ اُس نے اُسے اُٹھا کر فرسٹ کلاس میں بٹھا دیا۔

اِس سے بھی عجیب واقعہ اُس ہتھنی کا ہے جس کا بچّہ پہاڑی ندی کی بپھری ہُوئی موجوں میں بہ گیا اور ہتھنی نے اُسے بڑی ہوشیاری اور عقل مندی سے موت کے مُنھ سے بچایا تھا۔ ہُوا یوں کہ ایک دِن اپر ٹانڈون ندی میں سیلاب آگیا۔ میرا کیمپ اِسی ندی کے کنارے پر لگا تھا۔ میں کیمپ میں بیٹھا ندی کی موجوں کا شور سُن رہا تھا کہ اچانک کسی ہاتھی کے زور زور سے چنگھاڑنے کی آواز آئی۔ میں خیمے سے نکل کر ندی کی طرف دوڑا۔ یہاں ندی کے دونوں کناروں پر اُونچی اُونچی چٹانیں تھیں اور اِنھی چٹانوں کے نیچے سے ہاتھی کی چیخوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں جلدی سے ایک چٹان پر چڑھا، نیچے جُھک کر دیکھا اور پھر دیکھتا ہی رہ گیا۔

پہاڑی ندی کی تیز و تُند موجوں کے درمیان ہمارے کیمپ کی ایک ہتھنی کھڑی چنگھاڑ رہی تھی اور اُس نے سُونڈ میں اپنا تین مہینے کا بچّہ اُٹھا رکھا تھا۔ شاید دونوں ماں بیٹے پانی پینے آئے تھے کہ سیلاب میں پھنس گئے۔ ہتھنی جس جگہ کھڑی تھی، وہاں پانی سات آٹھ فُٹ گہرا تھا اور اُس کا بہاؤ اِتنا تیز تھا کہ بھاری بھرکم ہتھنی لڑکھڑا رہی تھی۔ یکایک پانی کا ایک زبردست ریلا آیا جس سے ہتھنی ڈگمگا گئی اور اُس کی سُونڈ سے بچّہ چھُوٹ کر پانی میں گر پڑا۔ اُس وقت کا منظر میں کبھی نہیں بھُولوں گا۔ پانی بچّے کو بہائے لیے جا رہا تھا اور مامتا کی ماری ماں اُس کے پیچھے پیچھے دوڑ رہی تھی۔ آخر پچاس ساٹھ گز دُور اُس نے بچّے کو جا لیا اور سُونڈ میں جکڑ کر اُوپر اُٹھا لیا۔ اِس پہاڑی ندی میں جس تیزی سے سیلاب آتا ہے، اُسی تیزی سے اُتر بھی جاتا ہے۔ پانچ چھ منٹ بعد پانی کا زور ٹوٹ گیا اور ہتھنی بچّے کو لے کر کنارے پر آگئی۔ اُس وقت اُس کی حالت دیکھنے سے تعلّق رکھتی تھی۔ کبھی بچّے کے گرد چکّر لگاتی، کبھی اُس کے سر پر پیار سے سُونڈ پھیرتی اور کبھی مارے خوشی کے چیخنے لگتی۔ یہ دیکھ کر مُجھ جیسے پتّھر دل انسان کی آنکھوں میں بھی آنسُو آ گئے۔

پرنالہ وہیں رہا

مقبول انور داؤدی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے صحابہؓ کو اپنے نبیِ آخرالزماںؐ سے جو محبت اور اُلفت تھی اور جس طرح اللہ کے رسولؐ کی فرماں برداری اُن کی گھُٹی میں پڑی ہوئی تھی، اُس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملے گی۔ مسلمانوں کو رسولؐ اللہ کا ادب و احترام قرآنِ حکیم نے سکھایا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "اے ایمان والو! اپنی آوازوں کو نبیؐ کی آواز سے بلند نہ کرو۔ ایسا نہ ہو تمھارے نیک عمل ضائع ہو جائیں۔"

اِس اطاعت و اِحترام کی سیکڑوں مثالیں ہیں، لیکن ہم یہاں صرف ایک واقعہ پیش کرتے ہیں۔

رسولؐ اللہ جب ہجرت کر کے مدینے تشریف لائے اور مسجدِ نبوی تیار ہو گئی تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے جو حضورؐ کے چچا تھے، مسجدِ نبوی کے پاس اپنا ایک مکان بنایا اور بارش کا پانی نکلنے کے لیے چھت پر جو پرنالہ لگایا اُس کا پانی مسجد میں گرتا تھا۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد خلیفۂ اوّل حضرت ابُو بکر صِدّیق رضی اللہ عنہ کا زمانۂ خلافت آیا لیکن پرنالے پر کسی نے اعتراض نہ کیا۔

جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے اور اُنھوں نے دیکھا کہ بارش کے دنوں میں حضرت عباسؓ کے پرنالے کا پانی مسجدِ نبوی میں گرتا ہے اور اس سے نمازیوں کے کپڑوں پر چھینٹے پڑتے ہیں تو اُنھوں نے حکم دیا کہ پرنالہ اُکھاڑ دیا جائے۔ لہٰذا خلیفہ کے حکم کی تعمیل ہُوئی اور پرنالہ اُکھاڑ دیا گیا۔

جب حضرت عباسؓ کو اِس واقعے کا علم ہُوا تو اُنھوں نے مدینے کے قاضی حضرت اُبَی بن کعب رضی اللہ عنہ کی عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا کہ خلیفۂ وقت نے میرا پرنالہ اُکھاڑ دیا ہے۔

قاضی اُبَی بن کعبؓ نے خلیفۂ وقت کو حکم نامہ بھیجا کہ وہ عدالت میں پیش ہو کر بیان کریں کہ کیا حضرت عباسؓ کا دعویٰ سچا ہے۔

خلیفۂ وقت حضرت عمرؓ تاریخِ مُقررہ پر قاضی صاحب کی عدالت میں پیش ہُوئے تو قاضی صاحب نے پُوچھا "کیا حضرت عباسؓ کا دعویٰ دُرست ہے؟"

حضرت عمرؓ نے جواب دیا "میں پرنالہ اُکھڑوانے کی ذمّہ داری قبول کرتا ہُوں۔ یہ پرنالہ اس لیے اُکھڑوایا گیا ہے کہ اِس کا پانی مسجدِ نبوی میں گرتا تھا، جس سے نمازیوں کے کپڑے خراب ہوتے تھے۔ میں نے اپنی سمجھ کے مُطابِق کوئی غلط کام نہیں کیا۔"

اب قاضی صاحب نے حضرت عباسؓ سے پُوچھا "آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

حضرت عباسؓ نے جواب دیا "جب سے یہ مکان بنا ہے، پرنالہ وہیں تھا اور اس پرنالے کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حکم سے یہاں لگایا گیا تھا۔ حضورؐ نے مجھے حکم دیا تھا کہ چچا، میرے کندھوں پر کھڑے ہو کر پرنالہ لگا دو۔ چُنانچہ مَیں نے حضورؐ کے ارشاد پر وہاں پرنالہ لگا دیا۔ رسولؐ اللہ کے بعد حضرت ابُو بکر صِدّیقؓ نے پرنالے پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ لیکن جب حضرت عمرؓ کا زمانۂ خلافت آیا تو اُنھوں نے بغیر مجھ سے پُوچھے پرنالہ اُکھڑوا دیا۔"

قاضی صاحب نے حضرت عباسؓ سے پُوچھا "آپ اپنے دعوے کے ثبوت میں کوئی گواہ پیش کر سکتے ہیں؟" حضرت عباسؓ نے فرمایا "اِس واقعے کے کئی گواہ ہیں۔" چُنانچہ حضرت عباسؓ گواہ لے آئے، جنھوں نے اِس بات کی تصدیق کی کہ پرنالہ رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ہی لگوایا تھا۔

اُس وقت مسلمانوں کے خلیفہ حضرت عمرؓ بن الخطاب کی عجیب حالت تھی۔ اُن کا سر جُھکا ہُوا تھا اور پیشانی پر ندامت سے پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ آپ آگے بڑھے اور حضرت عباسؓ سے کہا "خدا کے لیے میرا قصور معاف کر دیجیے۔ مجھے علم نہ تھا کہ یہ پرنالہ رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حکم کے مُطابِق لگا تھا۔ اِس کی تلافی یُوں ہو سکتی ہے کہ آپ میرے کندھوں پر کھڑے ہو کر اُس پرنالے کو دوبارہ اُسی جگہ لگا دیں۔"

حضرت اُبَی ابن کعبؓ نے کہا "یا امیرُالمومنین، ہونا بھی یہی چاہیے جو آپ نے تجویز کیا ہے۔"

حضرت عمرؓ اور حضرت عباسؓ عدالت سے لوٹ کر مسجدِ نبوی میں آئے تو لوگوں نے دیکھا کہ وہ عمرؓ جن کے خوف سے قیصر و کسریٰ اپنے گھروں میں بیٹھے کانپ جایا کرتے تھے، دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہیں اور حضرت عباسؓ اُن کے کندھوں پر کھڑے ہو کر اپنے مکان کا پرنالہ لگا رہے ہیں۔

پرنالہ لگ چُکا تو حضرت عباسؓ نیچے اُتر آئے اور اُنھوں نے حضرت عمرؓ سے کہا "یا امیرُالمومنین، میرا حق مجھے مِل گیا اور آپ نے رسولؐ اللہ کی اِطاعت و فرماں برداری کی ایک روشن مثال قائم کر دی۔ سب سے پہلے تو میں آپ سے اِس بے ادبی کی معافی مانگتا ہُوں کہ میں نے آپ کے کندھوں پر چڑھ کر پرنالہ لگایا۔ اس کے بعد میں اِس مکان کا مالک نہیں ہُوں، میں اپنے اِس مکان کو اللہ کی راہ میں وقف کرتا ہوں۔ اور آپ کو اِس بات کا اختیار دیتا ہُوں کہ اِس مکان کو گِرا کر مسجدِ نبوی میں شامل کر لیا جائے تاکہ مسجد اور وسیع ہو جائے اور نمازیوں کو سہولت ہو۔"

چُناں چہ حضرت عباسؓ کے اس مکان کو مسجدِ نبوی میں شامل کر لیا گیا۔

اللہ دیکھ رہا ہے

آغا شیدا کاشمیری

کسی گاؤں میں ایک بُڑھیا رہتی تھی۔ نہایت غریب۔ اُس کا ایک لڑکا تھا۔ انور۔ انور کا باپ بچپن ہی میں اللہ کو پیارا ہوگیا تھا۔ ماں نے محنت مزدوری کر کے اپنے بچّے کی پرورش کی تھی۔

انور بلا کا ذہین تھا۔ اُس نے گھر پر دینی تعلیم حاصل کی اور سکول سے بھی چوتھی جماعت پاس کرلی۔ آگے تعلیم جاری رکھنے کے لیے روپے کی ضرورت تھی۔ ماں میں اتنی سکت کہاں کہ وہ تعلیم کا بوجھ برداشت کر سکتی۔ مجبوراً انور کو سکول چھوڑنا پڑا۔

اب وہ مزدوری کر کے جو کچھ کما کر لاتا، اُس سے دونوں ماں بیٹے کی گزراوقات ہوتی۔ ایک مرتبہ گاؤں میں ایسا قحط پڑا کہ لوگ بھوکوں مرنے لگے۔ انور نے ماں سے کہا:

”اماں، اگر آپ اجازت دیں تو میں پاس کے شہر میں جا کر کوئی کام ڈھونڈوں، جس سے ہمارا گزارا اچھی طرح ہو جائے۔“

ماں کا دل بھر آیا۔ مگر جبر کر کے اُسے جانے کی اجازت دے دی۔ جب انور اپنا سامان باندھ کر رُخصت ہونے لگا تو ماں نے کہا ”بیٹا، خیر سے جاؤ اور خیر سے آؤ۔ خدا تمھارا مددگار ہو۔ چند باتیں میری یاد رکھنا۔ خدا تمھیں ہر وقت دیکھ رہا ہے۔ اگر تم سات پردوں میں بھی چھپ کر کوئی کام کرو گے تو بھی اللہ پاک تمھیں دیکھ رہا ہو گا۔“

انور نے کہا ”خدا نے چاہا تو میں ان باتوں کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔“

ماں نے دُعائیں دیں اور مُسکراتے ہُوئے اُسے خدا حافظ کہا۔

انور ماں سے رُخصت ہو کر شہر آیا اور کام کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا۔ لیکن کسی جگہ شنوائی نہ ہوئی۔ جہاں جاتا لوگ دُھتکار دیتے۔ چار پانچ دن اِسی طرح گزر گئے۔ ایک دن اُسے اپنا ایک دوست اِقبال مل گیا۔ انور نے اسے سارا ماجرا سُنایا۔ اِقبال اُس کو اپنے گھر لے گیا اور اُس کی سفارش سے انور کو ایک چھوٹے سے کارخانے میں کام مل گیا۔

کارخانے کا مالک بہت امیر آدمی تھا مگر دولت نے اُسے خدا سے غافِل نہیں کیا تھا۔ وہ محنت سے روپیہ کماتا اور اُسے بھلے کاموں پر صَرف کرتا۔ اُسے ایک ایسے آدمی کی ضرورت تھی جو ایمان دار ہو اور اُس کی آمدنی کا حساب کتاب رکھے۔ جب انور نوکری کے لیے اُس کے پاس آیا تو اُس نے اُس کے چہرے پر نیکی کے آثار دیکھے۔ چُناں چہ اُس نے انور کو ملازم رکھ لیا اور یہ دیکھنے لگا کہ اُس کی عادتیں کیسی ہیں اور وہ کس طرح کام کرتا ہے۔

انور ہر وقت اپنی ماں کی نصیحت کو یاد رکھتا تھا۔ کارخانے کے دُوسرے کاری گروں کا یہ حال تھا کہ جب تک مالک موجُود رہتا، محنت سے کام کرتے۔ مگر جب وہ اِدھر اُدھر ہوتا تو سُستی کرنے لگتے۔ مگر انور ایسا نہ تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ مالک موجُود ہو یا نہ ہو، اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے کہ میں اپنے کام کو

ایمان داری سے کر رہا ہوں یا نہیں۔

مالک نے جلد ہی معلوم کر لیا کہ انور سب سے زیادہ اور سب سے اچھا کام کرتا ہے۔ اُس نے فیصلہ کر لیا کہ انور کو حساب کتاب کا کام سکھا کر اپنا خزانچی بنائے گا۔ مگر ایسا کرنے سے پہلے اُس کی ایمان داری کا اِمتحان لینا ضروری تھا۔

اور آج انور کا اِمتحان تھا۔ مالک نے انور کو بُلایا اور حساب کا رجسٹر اُسے دے کر کہا کہ الماری میں تین ہزار روپیہ پڑا ہے۔ گِن کر دیکھ لو کہ حساب کے مُطابق ہے۔ انور نے رجسٹر لیا، حساب دیکھا، پھر الماری کھولی اور روپیہ گِننا شروع کیا۔ پانچ سو رُوپے ایسے تھے جن کا حساب میں ذِکر نہ تھا۔ اگر وہ یہ روپیہ لے لیتا تو کوئی ثبوت ایسا نہ تھا جس سے ثابت کیا جاسکتا کہ اُس نے چوری کی ہے۔

شیطان انور کو بہکانے لگا کہ اِس رقم سے تمھاری زندگی سنور جائے گی۔ اِسے لے لو اور چپکے سے جیب میں ڈال لو۔ لیکن یکایک اُس کے کانوں میں ایک آواز گُونجنے لگی:

"چاہے تم سات پردوں میں چھپ کر کوئی کام کرو۔ پھر بھی اللہ تمھیں دیکھ رہا ہے۔"

وہ پکار اُٹھا "میرا پروردگار مجھے دیکھ رہا ہے۔ یہ رُوپے پرائے ہیں۔ مجھے اِنھیں ہاتھ لگانے کا کوئی حق نہیں۔"

یہ کہ کر اُس نے لاحول پڑھی اور روپے الماری میں رکھ دیے۔

اِتنے میں کارخانے کا مالک آ گیا۔ اُس نے پُوچھا "انور، تم کس سے باتیں کر رہے تھے؟"

انور نے کہا "جناب، میں اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا۔"

مالک نے پُوچھا "مُعاملہ کیا تھا؟"

اب انور سے ضبط نہ ہو سکا۔ کہنے لگا "جناب، آپ نے مجھے حساب کتاب کرنے کے مُتعلق کہا تھا۔ میں نے حساب کیا تو پانچ سو رُوپے ایسے ملے جن کا ذِکر رجسٹر میں نہیں تھا۔ شیطان مجھے بہکانے لگا کہ ان کو اُڑا لو۔ مگر عین وقت پر مجھے اپنی ماں کی نصیحت یاد آ گئی کہ چاہے تم سات پردوں میں چھپ کر بھی کوئی کام کرو، پھر بھی اللہ تمھیں دیکھ رہا ہے۔ اِس نصیحت کا یاد آنا تھا کہ میں اپنے آپ کو لعنت ملامت کرنے لگا۔"

کارخانے کے مالک نے اُسے شاباش دی اور کہنے لگا "تم واقعی ایمان دار ہو۔ میں نے تمھارے اِمتحان کی خاطر پانچ سو رُوپے الماری میں رکھ دیے تھے۔ آج سے تم میرے خزانچی ہو۔"

اُس نے انور کی معقُول تنخواہ مُقرر کر دی اور اُسے ایک مکان رہنے کے لیے دے دیا۔ تھوڑے دنوں بعد انور نے اپنی ماں کو بھی اپنے پاس بُلا لیا اور دونوں ماں بیٹا آرام سے زندگی بسر کرنے لگے۔

ڈک بِل

ڈک بِل (DUCK BILL یعنی بطخ کی سی چونچ والا) دنیا کا عجیب و غریب جانور ہے۔ اس کی چونچ بطخ کی سی، بال بِلّی جیسے اور دُم اُود بلاؤ کی سی ہوتی ہے۔ چار پَیر ہوتے ہیں اور پچھلے پیروں میں ایک تھیلی ہوتی ہے جس میں زہر بھرا ہوتا ہے۔

ڈک بِل خشکی اور تری دونوں جگہ رہتا ہے۔ پرندوں کی طرح انڈے دیتا ہے اور دُودھ پلانے والے جانوروں کی طرح اپنے بچّوں کو دُودھ پلاتا ہے۔ جنوب مشرقی آسٹریلیا میں پایا جاتا ہے۔ کیڑے کوڑے کھاتا ہے۔ لوگ اسے اپنے گھروں میں پالتے بھی ہیں۔

چیونٹی خور

یہ ایک دُودھ پلانے والا چوپایہ ہے۔ انگریزی میں اسے ANT EATER کہتے ہیں۔ وسطی اور جنوبی امریکا میں پایا جاتا ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو وہ جس کے بدن پر لمبے لمبے بال ہوتے ہیں اور دوسری وہ جس کے بدن پر بالوں کے بجائے چھلکے سے ہوتے ہیں۔ یہ جانور صرف چیونٹیاں کھاتا ہے۔ اس کی زبان لمبی اور لیس دار ہوتی ہے۔ جب اپنی زبان چیونٹیوں کے بل میں ڈالتا ہے تو ہزاروں چیونٹیاں اُس پر چمٹ جاتی ہیں اور وہ اُن کو چٹ کر جاتا ہے۔ اس جانور کے دانت نہیں ہوتے۔

قائدِاعظم محمّد علی جناح

دُنیا کے لیڈروں میں ہمارے قائدِاعظم کا رُتبہ اِس لحاظ سے بہت بلند ہے کہ آپ نے خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر محض اپنی عقل و دانش سے دُنیا میں ایک نئی اور آزاد مملکت قائم کی اور برِّصغیر کے کروڑوں مسلمانوں کو انگریزوں کی غلامی سے نجات دِلائی۔

قائدِاعظم 25 دسمبر 1876 کو کراچی میں پیدا ہُوئے۔ آپ کے والد جناح پُونجا راج کوٹ (کاٹھیاواڑ) کے رہنے والے تھے اور کراچی میں چمڑے کا کاروبار کرتے تھے۔ آپ نے اِبتدائی تعلیم کراچی کے مشہور سکول سندھ مدرسۃ الاسلام میں پائی اور پھر وکالت کی تعلیم حاصل کرنے اِنگلستان تشریف لے گئے۔ بیس سال کی عمر میں آپ بیرسٹر بن کر ہندوستان واپس آئے۔ آپ نے چھ مہینے بمبئی میں پریزیڈنسی مجسٹریٹ کے عُہدے پر کام کیا، لیکن مُلازمت آپ کی طبیعت کے مُوافق نہ تھی۔ آپ نے مُلازمت چھوڑ کر وکالت شرُوع کی جس سے خاصی آمدنی ہونے لگی۔

اُن دِنوں ہندوستان میں ایک ہی بڑی سیاسی جماعت تھی اور وہ تھی کانگرس جس پر ہندوؤں کا غلبہ تھا۔ یہ جماعت ہندوستان کی آزادی کی جدّوجہد میں پیش پیش تھی۔ قائدِاعظم اِس جماعت میں شامِل ہوگئے۔ لیکن جب آپ نے دیکھا کہ ہندو مسلمانوں سے اِنصاف نہیں کریں گے تو آپ کانگرس کو چھوڑ کر مسلم لیگ میں شامِل ہو گئے جو اُس وقت مسلمان نوابزادوں اور خان بہادروں کی جماعت تھی۔ آپ نے مُسلم لیگ میں نئی رُوح پھُونکی اور اُسے مُسلمان عوام کی جماعت بنا دیا۔ آپ ہندو مُسلم اتّحاد کے زبردست حامی تھے اور چاہتے تھے کہ ہندو مُسلمان بھائیوں کی طرح مِل جُل کر رہیں۔ مگر جلد ہی آپ کو احساس ہوگیا کہ ہندو لیڈروں کی نیّتیں نیک نہیں۔ وہ آزادی کے بعد مُسلمانوں کو برابر کا درجہ نہیں دیں گے اور ہندوستان میں اُن کی حیثیت دُوسرے درجے کے شہریوں کی سی ہوگی۔ اِس سے قبل علّامہ اقبالؒ ہندوستانی مُسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ وطن کے قیام کی تجویز پیش کر چکے تھے۔ قائدِاعظم بھی اِسی نتیجے پر پہنچے کہ ہندو مسلمان اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ اُنھیں الگ ہو جانا چاہیے چُناں چہ 23 مارچ 1940 کو لاہور میں مسلم لیگ کا بہت بڑا جلسہ ہُوا جس کی صدارت قائدِاعظم نے کی۔ اِس جلسے میں مُسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ وطن پاکستان قائم کرنے کی قرارداد منظور ہُوئی۔ شرُوع میں انگریزوں اور ہندوؤں نے پاکستان کے قیام کی زبردست مخالفت کی لیکن آخرکار اُنھیں مُسلمانوں کے اِس مُطالبے کے آگے ہتھیار ڈالنا پڑے اور 14 اگست 1947 کو پاکستان قائم ہوگیا اور قائدِاعظم اس کے گورنر جنرل مُقرّر ہُوئے۔

سال ہا سال کی مُسلسل محنت سے آپ کی صحّت خراب ہوگئی تھی لیکن اِس حالت میں بھی آپ لگاتار کام کرتے رہے جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ پاکستان بننے کے صِرف تیرہ مہینے بعد، 11 ستمبر 1948 کو آپ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ آپ کا ہر عمل اور ہر قول ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے۔ آپ نے ہمیں جو نصیحتیں کی تھیں ہم اُن پر سچّے دل سے عمل کریں تو ہمارا وطنِ عزیز جنّت کا نمونہ بن سکتا ہے۔ آپ نے فرمایا:

■ اب پاکستان کا آزاد اور خود مُختار مُلک قائم ہو چُکا ہے اور مُسلمانوں کی وہ آرزو پُوری ہوگئی ہے جس کے لیے اُنھوں نے کئی سال تک جدّوجہد کی تھی اور بے اِنتہا قُربانیاں دی تھیں۔ اِس مُلک کے قائم ہونے سے ہماری ذِمّے داریاں بہت بڑھ گئی ہیں۔ ہمیں یہ ثابت کرنا ہے کہ ہم ایک قوم ہیں۔ ہم میں ذات پات کا کوئی فرق نہیں۔ ہم آپس میں مِل جُل کر محبّت اور امن کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔

■ ہماری قوم کے لیے تعلیم بہت ضروری ہے۔ دُنیا اِتنی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے کہ اگر آپ نے تعلیم حاصل نہ کی تو آپ نہ صِرف بہت پیچھے رہ جائیں گے بلکہ بالکل ختم ہو جائیں گے۔

دُنیا کی کوئی قوم اُس وقت تک ترقّی نہیں کر سکتی جب تک اُس کی عورتیں پڑھی لکھی نہ ہوں۔ عورتوں کو گھر میں بند کر کے رکھنا بہت بڑا جرم ہے۔ آج جس حالت میں ہماری عورتیں زندگی بسر کر رہی ہیں، وہ اِسلامی قانُون کے خلاف ہے۔

آپ بھی پوچھیے

س: کرسمس اور ایسٹر میں کیا فرق ہے؟ (محمد عمر افشین۔ سمن آباد لاہور)

ج: کرسمس (CHRISTMAS) اصل میں کرائسٹس ماس (CHRIST'S MASS) تھا یعنی کرائسٹ (حضرت عیسیٰؑ) کی نماز یا دُعا۔ عوام نے اسے کرسمس بنا دیا۔ یہ تہوار حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے یوم پیدائش (25 دسمبر) کے موقع پر منایا جاتا ہے۔ عیسائی اس دِن گرجوں میں جمع ہو کر نماز پڑھتے اور دُعائیں مانگتے ہیں۔

ایسٹر (EASTER) کا تہوار حضرت عیسیٰؑ کے دوبارہ زندہ ہونے کی خوشی میں منایا جاتا ہے۔ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو سُولی دینے کے بعد آپ کا جسمِ مُبارک ایک پہاڑی غار کے اندر رکھ کر اُس کا مُنہ پتّھر کی سِل سے ڈھک دیا گیا تھا۔ تیسرے دِن لوگوں نے دیکھا کہ سِل ہٹی ہُوئی ہے اور آپ کی لاش غائب ہے۔ اچانک غیب سے آواز آئی کہ یسُوع مسیحؑ (حضرت عیسیٰؑ) جی اُٹھے ہیں۔ آپ چالیس روز تک فلسطین میں رہے اور کئی لوگوں نے آپ کو دیکھا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ کو آسمان پر اُٹھا لیا۔ عیسائی فرقوں میں اس بات پر اختلاف ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے زندہ ہونے کا واقعہ کس تاریخ کو ہُوا تھا۔ اِس لیے ایسٹر کی کوئی خاص تاریخ مقرر نہیں ہے۔ یہ تہوار 22 مارچ سے 25 اپریل تک کسی بھی اتوار کو منایا جا سکتا ہے۔ (حضرت عیسیٰؑ پر ایک مضمون تعلیم و تربیت کے اس شمارے میں دیا گیا ہے۔)

س: دُنیا کا سب سے پہلا چڑیا گھر کب اور کہاں قائم ہُوا تھا؟ (مُجاہد حسین نقوی۔ کراچی)

ج: آج سے تقریباً تین ہزار سال پہلے چین کے ایک بادشاہ نے اپنے محل کے باغ میں بہت سے چرند، پرند اور درند جمع کیے تھے۔ وہ اُسے علم کا باغ کہتا تھا۔ دُنیا کا پہلا چڑیا گھر غالباً یہی تھا۔ موجودہ زمانے میں کیلی فورنیا (امریکا) کا سان ڈیگو زو، انگلینڈ کا لنڈن زو اور مغربی جرمنی کا برلن زو دُنیا کے سب سے بڑے چڑیا گھر ہیں۔

س: سب سے پہلے الیکشن (انتخابات) کس مُلک میں ہُوئے؟ (نصیر دُرّانی۔ راولپنڈی)

ج: الیکشن (ELECTION) کا انگریزی لفظ لاطینی زبان کے ایک لفظ سے بنایا گیا ہے جس کا مطلب ہے پسند کرنا، چُننا، مُنتخب کرنا۔ اپنے حاکم خود چُننے کا طریقہ پُرانے زمانے سے رائج ہے اور اِسے عوام کا حق سمجھا جاتا ہے۔ کئی مُلکوں کے لوگوں نے اپنا یہ حق منوانے کے لیے بڑی بڑی قربانیاں دی ہیں۔ قدیم اِسرائیلی سلطنت کے بادشاہوں کو عوام خود چُنتے تھے۔ قدیم یُونان کی شہری ریاستوں میں بھی عوام اپنے حاکموں کا اِنتخاب خود کرتے تھے۔ اُس وقت آبادی بہت کم تھی۔ لوگ شہر کے بڑے چوراہے میں جمع ہو جاتے اور زبان سے یا ہاتھ اُٹھا کر کسی شخص کے بارے میں اپنی پسند یا ناپسند کا اِظہار کرتے تھے۔

س: دنیا میں سب سے پہلے کس شخص نے اپنی ڈاڑھی مُنڈوائی؟ (میاں جاوید احمد۔ گوجرانوالہ)

ج: یہ بتانا ناممکن ہے۔ البتّہ تاریخی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ پُرانے زمانے کے مِصری بعض مذہبی رسموں کے موقع پر اپنی ڈاڑھیاں مُنڈوا دیتے تھے۔ ہندو بھی ایسا ہی کرتے تھے اور اب بھی کرتے ہیں۔ بلکہ ہندو تو ڈاڑھی کے ساتھ مُونچھیں، بھویں اور سر بھی مُنڈوا دیتے ہیں۔

ڈاڑھی شروع ہی سے مردانگی اور مذہبی تقدّس کی علامت رہی ہے اور دُنیا کی قدیم تہذیبوں میں اِسے عزّت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ سکندرِ اعظم سے پہلے یُونان کے لوگ بھی ڈاڑھیاں رکھتے تھے۔ لیکن جب سکندرِ اعظم بادشاہ ہُوا تو اُس نے اپنی اور اپنی فوج کی ڈاڑھیاں مُنڈوا دیں تاکہ جنگ میں دُشمن اُن کی ڈاڑھیاں نہ پکڑ سکے۔ اپنے بادشاہ کی دیکھا دیکھی یُونانی عوام بھی ڈاڑھیاں مُنڈوانے لگے۔

س: میوزیکل چیئرس (MUSICAL CHAIRS) کسے کہتے ہیں؟ (روبینہ الماس۔ اسلام آباد)

ج: ایک کھیل کا نام ہے۔ چند کُرسیاں دائرے میں رکھیے۔ اُن کی سیٹیں باہر کی جانب ہوں۔ کھیلنے والے بچّے اِن کُرسیوں کے سامنے کھڑے ہو جائیں (بچّوں کی تعداد سے ایک کُرسی کم ہونی چاہیے۔ اگر آٹھ بچّے ہوں تو کُرسیاں 7 ہوں) اب کوئی شخص ماؤتھ آرگن یا ٹیپ ریکارڈر پر کوئی دُھن بجائے۔ موسیقی شروع ہوتے ہی تمام بچّے ناچتے ہوئے کُرسیوں کے گرد چکّر لگانا شروع کر دیں۔ دو تین منٹ بعد موسیقی بند کر دی جائے۔ اس کے ساتھ ہی جو بچّہ جس کُرسی کے سامنے ہے، اُس پر جلدی سے بیٹھ جائے۔ جو بچّہ کھڑا رہ جائے گا، وہ کھیل سے خارج ہو جائے گا اور اپنے ساتھ ایک کُرسی بھی لے جائے گا۔ اب دُوسرا راؤنڈ شروع ہو گا۔ یہاں تک کہ آخر میں صرف دو بچّے رہ جائیں گے۔ (س۔ل)

ہنسیے، مسکرائیے

ایک شخص: پروفیسر صاحب، آپ تین عینکیں کیوں استعمال کرتے ہیں؟

پروفیسر: ایک دُور کی چیزیں دیکھنے کے لیے، دُوسری نزدیک کی چیزیں دیکھنے کے لیے اور ....

شخص: اور تیسری؟

پروفیسر: تیسری اِن دونوں کو دیکھنے کے لیے۔ (رانا امتیاز۔ واہ کینٹ)

ایک سرکاری ملازم دفتر سے کچھ کاغذات لایا۔ اُس کے بچّے اُنھیں اُلٹ پلٹ کرنے لگے۔ اِس پر اُس شخص نے کہا" یہ سرکاری کاغذات ہیں۔ اِنھیں ہاتھ مت لگاؤ۔"

اچانک اُن کاغذات میں سے ایک کیڑا نکل آیا۔ ایک بچّہ اُسے مارنے دوڑا تو دُوسرا بچّہ بولا" اِسے ہاتھ مت لگانا یہ ابّو کا سرکاری کیڑا ہے۔"

(شبانہ عندلیب۔ گوجرانوالہ)

دو دوست اپنے آپ کو بہت چالاک سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ اُنھیں لاہور جانا پڑا۔ ٹرین میں بہت بھیڑ تھی اور رات کا وقت تھا۔ اُنھوں نے شور مچانا شروع کر دیا کہ ڈبّے میں سانپ گھس آیا ہے۔ تمام مُسافر نیچے اُتر گئے اور وہ دونوں خالی برتھوں پر سو گئے۔

صبح کو اُن کی آنکھ کھلی تو اُنھوں نے ایک قُلی سے پُوچھا" کیا لاہور آگیا؟"

قُلی بولا" ارے میاں، کل رات اِس ڈبّے میں سانپ گھس آیا تھا، اِس لیے اِسے ٹرین سے کاٹ دیا گیا تھا۔ جب سے یہ یہیں کھڑا ہے۔"

(محمّد رضوان۔ اورنگی ٹاؤن کراچی)

ایک صاحب بہت کنجوس تھے۔ وہ ہیلمٹ خریدنے بازار گئے تو دکان دار نے 150 روپے قیمت بتائی۔ سستا سستا کہتے کہتے وہ سب سے سستا ہیلمٹ بھی دیکھ چکے تو اُنھوں نے دُکان دار سے پُوچھا" اِس سے سستا نہیں ہے؟"

دُکان دار بولا" یہ لیجیے پانچ رُوپے۔ سامنے کی دُکان سے سر مُنڈوائیں اور اُوپر رنگ کروالیں۔"

(عُمر عنایت۔ والٹن روڈ لاہور کینٹ)

ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر دو میاں بیوی کھڑے ٹرین کا اِنتظار کر رہے تھے۔ اُن کے ساتھ قُلی کھڑا تھا جس کے سر پر اور ہاتھوں میں آٹھ دس سُوٹ کیس تھے۔ اچانک میاں نے بیوی سے کہا" تم اپنی سنگھار میز بھی لے آتیں تو اچھا تھا۔"

بیوی تُنک کر بولی" اِس وقت مذاق کی کیا تُک ہے؟"

"یہ مذاق نہیں ہے میں ٹکٹ سنگھار میز پر بھول آیا ہُوں" میاں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

ایک عورت نے کسی فقیر کو پُرانے کپڑے دیتے ہُوئے کہا" یہ میرے مرحُوم شوہر کے کپڑے ہیں۔"

کپڑوں پر دھبّے پڑے ہُوئے تھے اور جگہ جگہ سُوراخ تھے فقیر نے کہا" آپ کے شوہر بڑے خُوش نصیب تھے۔ بالکل مُناسب وقت پر رِحلت کر گئے۔"

(عبدالغفور شاد۔ ڈنڈوت)

بیٹا: ابّا جان کیا یہ دُرست ہے کہ بڑوں کا علم بچّوں سے زیادہ ہوتا ہے؟

باپ: ہاں، یہ دُرست ہے۔

بیٹا: اچھا تو یہ بتائیے کہ ٹیلی فون کس نے ایجاد کیا تھا؟

باپ: گراہم بیل نے۔

بیٹا: گراہم بیل نے کیوں ایجاد کیا؟ اُس کے باپ نے کیوں نہیں کیا؟

(خواجہ نعیم احمد۔ لاہور)

ہوائی جہاز میں بیٹھے ہُوئے ایک شخص نے کہا" اگر میں دس رُوپے نیچے پھینک دُوں تو مجھے دس لوگ دُعائیں دیں گے۔"

دُوسرا مُسافر بولا" اگر میں پچاس رُوپے نیچے پھینکوں تو پچاس لوگ مجھے دُعائیں دیں گے۔"

تیسرے مُسافر نے کہا" اگر میں خود نیچے گر جاؤں تو ساری دُنیا مجھے دُعائیں دے گی۔"

(عقیل احمد برڑو۔ مکلی ٹھٹہ)

ننّھے میاں اپنے چھ مہینے کے بھائی کو حیرت سے دیکھ رہے تھے جو گلا پھاڑ پھاڑ کر رو رہا تھا۔ آخر اُنھوں نے امّی سے پُوچھا" کیا ہمارا مُنّا جنّت سے آیا ہے؟"

امّی بولیں" ہاں، بیٹا۔"

ننّھے میاں سوچ کر بولے" اگر یہ بے وقوف رو رو کر فرشتوں کو تنگ نہ کرتا تو جنّت سے کیوں نکالا جاتا!"

(ذی شان احمد خان۔ لاہور)

1 ان ملے جُلے حروف میں ایک بُنیادی لفظ ہے۔ اس کا بتانا ضروری ہے۔ بنیادی لفظ سے وہ لفظ مُراد ہے جو مُعمّے میں دیے گئے نو حروف سے مِل کر بنتا ہے۔
2 دو حرفی لفظ قابلِ قبول نہ ہوگا۔ کوئی لفظ تین حروف سے کم کا نہ ہونا چاہیے۔
3 یہ بھی خیال رہے کہ ہ کو ھ (دو چشمی) نہ سمجھا جائے۔
4 انھی حروف کو اول بدل کر کے کم سے کم 100 بامعنی الفاظ بنائیں۔
5 حل کے ساتھ کوپن بھیجنا لازمی ہے۔
6 حل بھیجنے کی آخری تاریخ 10 دسمبر ہے۔

100 یا اس سے زیادہ الفاظ بنانے والے کو 100 روپے کی کتابیں، دوسرے نمبر پر 75 روپے کی کتابیں اور تیسرے نمبر پر 50 روپے کی کتابیں دی جائیں گی۔ اس کے علاوہ 31 انعام 25، 25 روپے کی کتابوں کے دیے جائیں گے۔

داؤدی عِلمی مُعمّا

جنوری 1989 سے داؤدی علمی معمّا ایک نئے انداز سے پیش کیا جائے گا۔

ماہ نومبر کا بنیادی لفظ "فاروقِ اعظم"

مندرجہ ذیل بچے اپنی محنت کی بنا پر انعام کے حق دار قرار پائے۔

	تعداد الفاظ
پہلا انعام: تجمل الیاس 48/S - 46/B اسلام آباد کالونی سمن آباد لاہور	300
دُوسرا انعام: نوشین مسعود 435 - پاک بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور	299
تیسرا انعام: ذوالفقار علی 48/S - 48/B اسلام آباد کالونی سمن آباد لاہور۔	267

25، 25 روپے کی کتابیں حاصل کرنے والے 31 ذہین بچے

افتخار بھٹی۔ گلی نمبر 73 مکان نمبر 680/36 بزاز محلہ صدر بازار لاہور کینٹ۔
خضر محی الدین۔ مکان نمبر 23 پانڈو سٹریٹ نمبر 108 اسلام پورہ لاہور۔
رانا عبدالحمید۔ 106-P سٹاف کالونی انجینئرنگ یونیورسٹی جی ٹی روڈ لاہور۔
ربیعہ عزیز۔ 430 محلہ وگری گراں، گھنٹا گھر کریم پورہ پشاور شہر۔
خرم قیام۔ 291/G-14 واہ کینٹ۔
محمد منیب احمد صدیقی۔ 672/C سیٹلائٹ ٹاؤن بہاول پور۔
رانا عدنان جاوید۔ مکان نمبر 769 گلی نمبر 25 وارڈ نمبر 15 گکھڑ منڈی ضلع گوجرانوالہ۔
خدیجہ بدر۔ P-8 سمن آباد کالونی گوجرہ ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ۔
فیصل عزیز۔ قصر گل، مرزا روڈ اٹک۔

دماغ لڑاؤ

ہر حل کے ساتھ اس کوپن کا بھیجنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 دسمبر ہے۔

نام ____________ عمر ____________

پتا ____________________________

توصیف جاوید ہاشمی۔ 84 گل زیب کالونی سمن آباد لاہور۔
محمد اسلام۔ مکان نمبر 650/32 وارڈ نمبر 17 گلی کھٹیکاں والی پُرانا حاصل پُور ضلع بہاول پور۔
بُشریٰ قریشی معرفت شہزادہ عبدالرحمٰن ملٹسٹر، مکان نمبر T-615 گاؤں جنگل خیل محلہ پیر خیل ضلع کوہاٹ۔
عمار مُتی الحسنین۔ 2/4 سی، گلی نمبر 60 - G-7/2 اسلام آباد۔
فرخندہ خان کھوسہ۔ مکان نمبر 2069/A عقب بکر منڈی حضوری باغ اڈہ ملتان۔
فخر عالم سلیمان۔ محلہ ڈھیری خیل، نوشہرہ کلاں صوبہ سرحد۔
شہناز سجّاد۔ چوہدری محمد خان، مسجد والی گلی نزدیک سیشن کورٹ پریم نگر سیالکوٹ۔
صدف حمید۔ واپڈا کالونی 220 کے وی گرڈ سٹیشن گکھڑ منڈی ضلع گوجرانوالہ۔
شمائلہ محبّ اللہ۔ 1/B پبلک سکول لطیف آباد نمبر 3 حیدر آباد۔
سیّد سلمان احمد معرفت سیّد عرفان احمد۔ مکان نمبر 8 آئی 8 سیکٹر گلی نمبر 11۔ اسلام آباد۔
ثوبیہ ہاشمی۔ پیپلز کالونی نمبر 2 کوٹھی نمبر 464 بابر چوک فیصل آباد۔
جمال عبدالناصر عاصم۔ محلہ عالم شاہ نمبر 2 پنڈدادن خان ضلع جہلم۔
نذیر احمد۔ مکان نمبر 626 سعود آباد ملیر کراچی۔
بابر رضوان مبارک۔ نشاط پارک پیرس روڈ سیالکوٹ۔
عمران یوسف۔ معرفت عبدالرحمٰن ٹھیکیدار، نوشہرہ روڈ گوجرانوالہ۔
اویس احمد باجوا۔ 40 - ٹی گلبرگ II گنگ محل لاہور۔
سیّدہ شاہ بانو۔ A-65 بلاک نمبر 2 گلشن اقبال کراچی۔
جعفر ظہیر۔ معرفت عبدالستار ظہیر چغتائی 50 پنجاب جہلم کینٹ۔
محمد خالد احمد۔ 475/Q ماڈل ٹاؤن لاہور۔
اسد رفیع۔ 178/C سرور روڈ راولپنڈی کینٹ۔
عدنان اقدس۔ 9 - شالامار ٹاؤن باغبانپورہ لاہور۔
دُرِّ شہوار شاہین۔ مکان نمبر 9/65 محلہ اسلام پورہ سیالکوٹ نمبر 1

ناگ نے جہاز کو بادلوں میں جاتے دیکھ لیا تھا۔ کامران کو اپنے سینے سے لگائے ناگ عقاب کی شکل میں، آسمان کی فضاؤں میں پرواز کر رہا تھا۔ وہ تیزی سے غوطہ لگا کر نیچے آگیا۔ نیچے اُونچی نیچی پہاڑیوں کا سلسلہ پھیلا ہُوا تھا۔ ان پہاڑیوں پر جنگلی جھاڑیاں اُگی ہُوئی تھیں۔ سارا علاقہ برساتی نالوں اور کھڈوں سے بھرا ہُوا تھا۔ آسمان پر بادل آنا شروع ہو گئے تھے۔ ناگ نے کامران کو ایک خشک برساتی نالے کے پاس، پتھر کے ایک چبوترے پر بٹھایا اور انسانی شکل اختیار کر کے بولا:

"شیطانی مُردہ جہاز میں ہی ہے۔ اُس نے تمہارا پُراسرار طاقت والا نقاب ضرور اپنے بریف کیس میں چھپایا ہُوا ہوگا۔ میں نے یہ بریف کیس اُس کے پاس دیکھا تھا۔"

کامران نے کہا "ناگ بھیا! ہمیں اس شیطان سے پُراسرار نقاب واپس لینا ہے۔ اگر یہ نقاب اُس کے پاس رہ گیا تو وہ ہمارے مُلک میں تباہی مچا دے گا۔"

ناگ بولا "تم فکر نہ کرو۔ میں تمہارا نقاب لے کر ہی واپس آؤں گا۔ تم یہاں میرا انتظار کرنا۔"

یہ کہ کر ناگ نے ایک بار پھر عقاب کی شکل بدلی اور پُوری طاقت سے اُوپر کی طرف اُڑان بھری، جس طرح کوئی ہوائی جہاز رن وے سے پرواز کے لیے بلند ہوتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ بادلوں میں گم ہو گیا۔ کامران دل میں دُعائیں مانگنے لگا کیونکہ پُراسرار نقاب کے بغیر وہ معاشرے میں موجود غنڈوں اور بدمعاشوں کو ختم نہیں کر سکتا تھا۔

ناگ بادلوں میں اُڑتا چلا گیا۔ وہ اُس طرف جا رہا تھا جدھر شیطانی مُردے کا چھوٹا جہاز گیا تھا۔ دن کی روشنی چاروں طرف پھیلی ہُوئی تھی، مگر بادلوں میں ناگ کو جہاز کہیں بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اُڑتے اُڑتے وہ کافی دُور نکل گیا۔ پھر اُس نے اپنا رُخ اُوپر کی طرف کر لیا۔ تھوڑی دیر میں وہ بادلوں کے اُوپر آگیا۔ اب کالے کالے بادل اُس کے نیچے تھے اور اُوپر آسمان صاف تھا۔ اُس نے شمال کی طرف دیکھا۔ اُسے شیطانی مُردے کا جہاز نظر آگیا۔ جہاز بڑی تیزی کے ساتھ افغانستان کی سرحد کی طرف جا رہا تھا۔ ناگ نے بھی اپنی رفتار تیز کر دی۔ آخر وہ جہاز کے اُوپر پہنچ گیا۔ جہاز کے دونوں دروازے بند تھے۔ ناگ نے شیشے میں سے جھانک کر دیکھا۔ اُس وقت وہ جہاز کی رفتار کے برابر جہاز کی کھڑکی کے ساتھ ساتھ اُڑ رہا تھا۔ اندر اُسے شیطانی مُردہ دکھائی دیا جو پھر انسانی ہڈیوں کا ڈھانچا بن گیا تھا۔ مگر اُس نے سُوٹ پہن رکھا تھا۔ بریف کیس اُس کے پاس ہی تھا۔ اُس کے دونوں ساتھی اُس کے قریب بیٹھے تھے۔ ایک آدمی جہاز چلا رہا تھا۔

شیطانی مُردے نے ناگ کو عُقاب کی شکل میں دیکھا تو سمجھ گیا کہ یہ کامران کا ساتھی ہے اور اب پُراسرار نقاب کی تلاش میں وہاں آیا ہے۔ شیطانی مُردے نے چلّا کر اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "جہاز کو نیچے بادلوں میں لے جاؤ۔"

پائلٹ نے فوراً جہاز کی نوک نیچے کر دی۔ جہاز تیر کی طرح ایک بار پھر نیچے کو غوطہ لگا کر بادلوں میں آگیا اور کالے کالے بادلوں میں آتے ہی ناگ کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ناگ دیر تک بادلوں میں اُڑتا رہا مگر اُسے جہاز کہیں دکھائی نہ دیا۔ ایک جگہ بادل زیادہ گہرے نہیں تھے۔ اچانک ناگ کو جہاز کی آواز سنائی دی۔ اُس نے آواز کے پیچھے غوطہ لگایا۔ دوسرے ہی لمحے جہاز پر اُس کی نظر پڑ گئی۔ چھوٹا جہاز بادلوں میں ڈگمگاتا ہوا تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہا تھا۔ ناگ اب یہ موقع ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتا تھا۔ وہ اُچھلا اور اُس نے اپنے آپ کو پوری طاقت سے جہاز کے دروازے کے شیشے سے ٹکرا دیا۔ چھناکے کی آواز کے ساتھ دروازے کا شیشہ ٹوٹ گیا اور ناگ جہاز کے اندر آگیا۔

شیطانی مُردے نے جب دیکھا کہ ناگ نے اُسے گھیر لیا ہے تو اُس نے اپنی سیٹ پر لگے ہوئے بٹن کو دبا دیا۔ ایک جھٹکے کے ساتھ شیطانی مُردے کی سیٹ اپنی جگہ سے الگ ہو کر چھت کو چیرتی ہوئی جہاز سے باہر نکل گئی۔ ناگ بھی اُس کے پیچھے بادلوں میں اُوپر کو اُٹھا۔ جہاز کی چھت میں سوراخ ہوتے ہی جہاز کا توازن بگڑ گیا۔ پائلٹ نے جہاز کو سنبھالنے کی بڑی کوشش کی مگر جہاز اُس کے کنٹرول سے باہر ہو گیا اور لڑکھڑاتا ہوا نیچے گرنے لگا پھر بڑے زوردار دھماکے کے ساتھ ایک ٹیلے سے ٹکرایا اور اس میں آگ لگ گئی۔ شیطانی مُردہ تو مر نہیں سکتا تھا مگر اُس کے تینوں غنڈے ساتھی ہلاک ہو گئے تھے۔ ناگ بادلوں کے اُوپر آیا تو اُس نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ شیطانی مُردہ ہڈیوں کے ڈھانچے کی شکل میں بریف کیس ہاتھ میں لیے فضا میں پرواز کر رہا تھا۔ اُس نے گردن موڑ کر ناگ کی طرف دیکھا اور قہقہہ لگا کر بولا:

"میں جانتا ہوں تم ناگ ہو۔ مگر یاد رکھو! تم سب مل کر بھی میری غیر معمولی طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ پُراسرار نقاب میرے پاس ہے، جواب کامران کو کبھی نہیں مل سکے گا۔"

ناگ نے یہ سُنا تو سوچا کہ اُسے فوراً حملہ کر کے شیطانی مُردے سے بریف کیس چھین لینا چاہیے۔ اُس نے غوطہ لگایا کہ شیطانی مُردے کو اُوپر سے نیچے آکر جھپٹ لے لیکن شیطانی مُردہ بھی بے خبر نہیں تھا۔ جوں ہی ناگ اُس کی طرف جھپٹا، وہ غوطہ لگا کر نیچے چلا گیا۔ ناگ اُس کے پیچھے گیا۔ شیطانی مُردے کا ایک اور قہقہہ گونجا۔ اُس کی کھوپڑی میں آنکھوں کی جگہ جو سوراخ تھے، اُن میں سے تیز روشنی کی دو شعاعیں نکل کر ناگ کے جسم کو چھوتی ہوئی گزر گئیں۔ یہ شعاعیں اتنی گرم تھیں کہ ناگ کو اپنا جسم جلتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ ایک دم نیچے غوطہ لگا گیا۔ اس کے بعد جب اُوپر آیا تو شیطانی مُردہ غائب ہو چکا تھا۔ ناگ نے بادلوں کے اُوپر نیچے اور درمیان اُسے بہت تلاش کیا مگر وہ اُسے نہ مل سکا۔

ناگ مایوس ہو کر اُن پہاڑیوں کی طرف اُڑنے لگا جہاں وہ کامران کو چھوڑ آیا تھا۔ وہ عُقاب کی شکل میں اُڑتے ہوئے بادلوں کے نیچے آگیا۔ کالے کالے بادلوں کی وجہ سے دن کی روشنی بہت ہلکی ہو گئی تھی۔ لگتا تھا ابھی بارش شروع ہو جائے گی۔ وہ چھوٹی پہاڑیوں میں کامران کو تلاش کرنے لگا۔ یہ جان کر اُس کو بڑی حیرانی ہوئی کہ وہ راستہ بھول گیا تھا۔ اُسے وہ جگہ نہیں مل رہی تھی جہاں وہ کامران کو بٹھا کر آیا تھا۔ اُس نے سارا علاقہ چھان مارا مگر حیرت کی بات ہے کہ اُسے کامران کہیں نہ ملا۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ وہاں ساری پہاڑیاں ایک جیسی تھیں اور اُن سب پر جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔

ناگ دیر تک پہاڑیوں کے اُوپر اور گہری گھاٹیوں میں پرواز کرتے ہوئے کامران کو ڈھونڈتا رہا۔ لیکن کامران کو تو جیسے زمین کھا گئی تھی۔ کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پریشانی کے عالم میں وہ ایک پہاڑی کے دامن میں اُتر گیا۔ یہاں اُترتے ہی اُس نے انسان کی شکل اختیار کی اور ایک بار پھر کامران

کی تلاش شروع کر دی۔ اس وقت آسمان پر بادل گھرے ہوئے تھے اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ابھی موسلادھار بارش شروع ہو جائے گی۔

ناگ برابر کامران کو تلاش کرتا رہا، یہاں تک کہ دن کی روشنی کم ہونے لگی شام قریب آ رہی تھی۔ اب ناگ نے سوچا کہ چوں کہ اُسے شیطانی مُردے کا پیچھا کرتے کافی دیر ہو گئی ہے، اِس لیے بہت ممکن ہے کہ کامران انتظار کرتے کرتے تھک گیا ہو اور واپس لاہور چلا گیا ہو۔ اُس نے دل میں کہا: مجھے کامران کو لاہور جا کر تلاش کرنا چاہیے۔ وہ ضرور اپنے گھر پہنچ گیا ہے۔

اب ہم کامران کی طرف آتے ہیں کہ اُس پر کیا گزری؟ جب ناگ کو گئے کافی دیر ہو گئی اور وہ واپس نہ آیا تو کامران پہاڑی ٹیلوں کے درمیان پتھر کی سِل پر بیٹھے بیٹھے تھک گیا۔ اُس نے اُٹھ کر اِدھر اُدھر ٹہلنا شروع کر دیا۔ پھر بیٹھ گیا کہ شاید ناگ اُس کا پُراسرار نقاب لے کر واپس آ جائے، لیکن کافی وقت گزر گیا۔ سورج ڈوبنے لگا۔ بادل بھی گھرے ہوئے تھے۔ اب کامران کو خیال آیا کہ رات آ رہی ہے اور وہ جنگل کی ویران پہاڑیوں میں کب تک بیٹھا رہے گا۔ ممکن ہے ناگ کو کوئی حادثہ پیش آ گیا ہو یا وہ شیطانی مُردے کی تلاش میں بہت دُور نکل گیا ہو۔ اِس لیے یہی بہتر ہے کہ لاہور واپس چل کر ناگ کو اُس کے ہوٹل میں دیکھنا چاہیے۔ یہ سوچ کر وہ اُٹھا اور ایک طرف چلنے لگا۔ اُس کا خیال تھا کہ اِن اُونچے نیچے جنگلی ٹیلوں سے نکلنے کے بعد کوئی سڑک ضرور آ جائے گی جہاں سے اُسے کوئی نہ کوئی سواری مل جائے گی۔ اُسے بھوک اور پیاس بھی لگ رہی تھی۔ ٹیلوں میں سے گزرتے ہُوئے اُسے ایک جگہ پانی کا چھوٹا سا چشمہ دکھائی دیا جس کے کنارے کھجور کے دو چار درخت اُگے ہُوئے تھے۔ وہاں زمین پر بہت سی پکی ہُوئی کھجوریں گری پڑی تھیں۔ اِس وقت یہ کھجوریں کامران کو بڑی نعمت معلوم ہوئیں۔ اُس نے کھجوریں کھا کر بھوک اور پانی پی کر پیاس مٹائی اور اللہ کا نام لے کر پھر چل پڑا۔ بادل گرجنے لگے۔ شام کا اندھیرا بڑھتا چلا گیا۔ ٹیلے تھے کہ ختم ہی نہیں ہوتے تھے۔ کوئی کچّی سڑک بھی کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ چلتے چلتے تھک گیا۔

وہ دم لینے کے لیے ایک جگہ جھاڑی کے پاس بیٹھا ہی تھا کہ اُسے سانپ کی پھنکار سنائی دی۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک سبز رنگ کا سانپ پھن اُٹھائے اُس کی طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ خوف کے مارے اُس کا جسم سُن ہو گیا۔ اُس میں بھاگنے کی بھی ہمت نہ تھی۔ اگر اِس وقت اُس نے کالا نقاب پہن رکھا ہوتا تو وہ ہوا میں پرواز کر سکتا تھا۔ مگر اب نقاب کے بغیر وہ ایک عام کمزور سا لڑکا تھا۔ پھن دار سانپ بالکل اُس کے سامنے آ کر کُنڈلی مار کر بیٹھ گیا۔ کامران سمجھ گیا کہ اب وہ بچ نہیں سکے گا۔ ابھی سانپ اُچھل کر اُسے ڈس لے گا۔ وہ اس ویرانے کا کوئی بے حد زہریلا سانپ تھا۔

اچانک اُس کو یاد آ گیا کہ اُسے جب سانپ نے کاٹا تھا اور ناگ نے اُس کے جسم میں سے اُسی سانپ کی مدد سے سارا زہر باہر نکلوا دیا تھا تو ناگ نے اُس سے کہا تھا:

"کامران، ایک بات یاد رکھنا۔ اب تم پر کسی بھی سانپ کے کاٹے کا اثر نہیں ہوگا۔ اس سانپ کے ڈسنے سے تمھارے خون میں ایسی طاقت آ گئی ہے کہ زہریلے سے زہریلا سانپ بھی تمھیں ڈسے گا تو تم پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔"

اِس خیال سے کامران کو تھوڑا حوصلہ ضرور ہُوا لیکن سانپ آخر سانپ ہوتا ہے۔ کیا معلوم اس سانپ کے کاٹنے کا اثر ہو جائے۔ اُس نے محسُوس کیا کہ پھنیر سانپ اُسے کاٹنے کی بجائے اپنی جگہ پر کُنڈلی مارے بیٹھا ہے اور بار بار اپنا پھن اُس کے آگے جھکا دیتا ہے، جیسے اُس کو سلام کر رہا ہو یا کچھ کہنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اِتنے میں دُوسری طرف سے ایک اور سبز رنگ کا سانپ رینگتا ہُوا وہاں آ گیا۔ وہ سانپ بھی کُنڈلی مار کر کامران کے آگے بیٹھ گیا اور پہلے سانپ کی طرح اپنا پھن بار بار جھکانے لگا۔ کامران کو پسینا آ رہا تھا۔ وہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا مگر اس کے بدن میں طاقت ہی نہیں رہی تھی

پھر دونوں سانپوں نے اپنے اپنے پھن تین تین بار زمین کے ساتھ لگائے اور جدھر سے آئے تھے، رینگتے ہوئے اُدھر کو واپس چلے گئے۔ کامران کی جان میں جان آئی۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ بلا ٹل گئی۔ اب وہ حیران ہو کر سوچنے لگا کہ یہ کس قسم کے سانپ تھے کہ اُس کے سامنے کنڈلی مار کر بیٹھ گئے تھے اور بار بار پھن جھکا کر اُسے سلام کر رہے تھے۔

کامران اُس علاقے سے جتنی جلدی ہو سکے نکل جانا چاہتا تھا۔ اب شام ہو رہی تھی۔ ایک دم سے بادل گرجے اور بوندا باندی شروع ہو گئی۔ ہوا بھی ٹھنڈی ہو گئی۔ کامران جلدی جلدی چلنے لگا کہ جیسے بھی ہو، ان ویران ٹیلوں سے نکل جائے۔ بارش ہلکی تھی۔ موسلا دھار نہیں تھی۔ وہ تیز تیز قدم اُٹھاتا دو تین ٹیلوں کے قریب سے گزر گیا۔ آگے ایک چھوٹی سی کچی سڑک آئی تو وہ بڑا خوش ہوا۔ اِس کا مطلب تھا کہ کوئی گاؤں یا بڑی سڑک قریب ہی ہے۔ کامران کچی سڑک پر آیا تو اُسے اپنے پیچھے پھنکار کی آواز سنائی دی۔ اُس نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ وہ یہ دیکھ کر دہشت زدہ ہو گیا کہ دونوں سانپ پھن اُٹھائے اُس کے پیچھے پیچھے کوئی پندرہ بیس فٹ کے فاصلے پر، رینگتے چلے آ رہے ہیں۔ کامران کو رُکتے دیکھ کر دونوں سانپ بھی رُک گئے۔ کامران کو خوف بھی لگا اور حیرانی بھی ہوئی کہ یہ سانپوں کا جوڑا اُس کا پیچھا کیوں کر رہا ہے؟ ایک بات ظاہر تھی کہ دونوں سانپ اُسے نقصان نہیں پہنچانا چاہتے تھے۔ کیوں کہ اگر ایسی بات ہوتی تو اب تک وہ اُس کو ڈس چکے ہوتے۔ پھر وہ اُسے رُکتا دیکھ کر رُک نہ جاتے۔ یہ ایک عجیب معمّا تھا جو کامران کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اُس نے سانپوں کو ڈرانے کے لیے سڑک پر سے پتھر اُٹھایا تو دونوں سانپ تیزی سے ایک طرف جھاڑیوں میں چھپ گئے۔ کامران کچی سڑک پر چلنے لگا۔

بوندا باندی ہو رہی تھی۔ بادل بھی گرج رہے تھے۔ ہوا بھی سرد ہو گئی تھی اور شام کا اندھیرا بھی پھیلنے لگا تھا۔ چلتے چلتے کامران نے ایک ٹیلے کا موڑ کاٹا تو سامنے ایک گہرا پہاڑی نالا آ گیا۔ نالے پر جو پُل بنا ہوا تھا وہ ٹوٹ چکا تھا۔ کامران نے آگے بڑھ کر دیکھا۔ نالا بہت گہرا تھا اور اُس میں پانی بڑی تیزی سے شور مچاتا بہ رہا تھا۔ نالا پار کرنے کا سوائے پُل کے اور کوئی ذریعہ نہ تھا اور پُل درمیان سے ٹوٹ گیا تھا۔ کامران بڑا پریشان ہوا کہ آگے کیسے جائے؟ نالے کے پار اُسے سڑک کی روشنیاں دکھائی دینے لگی تھیں۔ وہ رات ہونے سے پہلے پہلے اِن روشنیوں تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ وہ بے بسی کی حالت میں اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ اچانک اُسے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا۔ شام کے ہلکے ہلکے اندھیرے میں ایک گھڑ سوار اُس کی طرف آ رہا تھا۔ اُس کے ساتھ ایک دوسرا گھوڑا بھی تھا جس پر زین کسی ہوئی تھی۔ گھڑ سوار دیہاتی نہ تھا۔ پڑھا لکھا شہری لگتا تھا اور اُس نے پتلون اور جیکٹ پہن رکھی تھی۔ عمر پچاس کے قریب ہو گی۔ سر پر شکاریوں والا ہیٹ تھا۔ ایک بندوق اُس کے کاندھے پر لٹکی ہوئی تھی۔

کامران بڑا خوش ہوا کہ کوئی انسان تو نظر آیا۔ اُس اجنبی شکاری کو اُس نے سلام کیا تو وہ گھوڑے سے نیچے اُتر آیا اور بولا "کیا بات ہے، بیٹے؟ تم یہاں کیوں کھڑے ہو؟"

کامران نے کہا "انکل، میں نالے کے پار جی ٹی روڈ پر جانا چاہتا ہوں۔ مگر پُل ٹوٹا ہوا ہے۔"

شکاری نے دو قدم آگے جا کر پُل کو دیکھا اور حیران ہو کر کہنے لگا "یہ پُل کیسے ٹوٹ گیا؟ صبح تو بالکل ٹھیک تھا۔ ضرور اُوپر سے کوئی بھاری پتھر گر کر اس پر گرا ہو گا جس سے بیچ میں سے ٹوٹ گیا۔ اب کیا کروں؟ مجھے بھی نالے کے پار بڑی سڑک پر جانا ہے۔"

کامران کا حوصلہ بڑھ گیا کہ اب وہ اکیلا نہیں ہے۔ شکاری نے ایک پل کے لیے ہیٹ ماتھے پر سے پیچھے سرکاتے ہوئے کچھ سوچا اور پھر چٹکی بجا کر بولا "ٹھیک ہے، ہم پیچھے کالی پہاڑی کے اُوپر سے ہو کر چلے جاتے ہیں۔ میرے ساتھ آ جاؤ بیٹا۔ میں بھی جی ٹی روڈ پر ہی جا رہا ہوں۔ اِتّفاق سے میرے پاس ایک فالتو گھوڑا بھی ہے۔ اِس پر بیٹھ جاؤ۔ آگے راستہ پیدل چلنے والا نہیں ہے۔"

کامران کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ وہ دُوسرے گھوڑے پر بیٹھ گیا، اور

دونوں گھوڑے کالی پہاڑی کی طرف چلنے لگے۔ بُوندا باندی اُسی طرح ہو رہی تھی۔ شکاری کا گھوڑا آگے آگے تھا۔ وہ کہنے لگا:

"بیٹا، تم اِدھر کہاں نکل آئے تھے؟ میں تو یہاں قریب ہی اپنے پُرانے قلعے میں رہتا ہُوں۔ ایک ضروری کام سے شہر جا رہا تھا کہ تم سے ملاقات ہو گئی۔"

کامران نے یُوں ہی ایک کہانی گھڑ کر سنا دی کہ میں اپنے بڑے بھائی کے ساتھ گاؤں کی سیر کرنے شہر سے آیا تھا کہ جنگل میں راستہ بھول کر اُس سے بچھڑ گیا۔"

شکاری بولا "خدا کا شکر کرو کہ میں تمھیں مل گیا، ورنہ تم یہاں سے سڑک تک نہیں پہنچ سکتے تھے اور رات کو یہاں اکثر ڈاکو اور قاتل پھرا کرتے ہیں۔"

کامران دل میں خدا کا شکر ادا کرنے لگا کہ اس مُصیبت کی گھڑی میں اسے ایک نیک دل انسان مِل گیا جو اُسے گھوڑے پر بٹھا کر اپنے ساتھ اِس جنگل سے نکال کر لے جائے گا۔ لیکن اُس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ وہ ایک بھیانک مُشکل میں پھنسنے والا ہے۔

شکاری کہہ رہا تھا "میرا تعلّق ایک پُرانے شاہی خاندان سے ہے۔ پہلے میں شہر میں رہتا تھا لیکن کچھ عرصے سے شہر چھوڑ کر، نوکر کے ساتھ، اپنے جنگل والے پُرانے قلعے میں آگیا ہُوں۔ بس شکار کھیلتا ہُوں اور کتابیں پڑھتا رہتا ہُوں۔"

چلتے چلتے وہ ایک پہاڑی کے پیچھے آئے تو کامران کی نظر ایک پُرانے شکستہ سے قلعے کی اُونچی کالی دیوار اور بڑے گیٹ پر پڑی جس کے باہر لالٹین جل رہی تھی۔ شکاری نے اُس طرف اشارہ کرتے ہُوئے کہا:

"یہ میرا گھر ہے۔ میں یہاں بڑے سکون کی زندگی بسر کر رہا ہُوں۔ شہر کے شور اور ہنگاموں سے دُور، یہاں مجھے بڑا اِطمینان ملتا ہے۔"

اچانک اُس نے اپنی جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور پریشان ہو کر بولا "ارے! میں اپنا بٹوا ساتھ لانا تو بھول ہی گیا۔ اچھا ہُوا کہ یاد آگیا، ورنہ شہر پہنچ کر سامان خریدتے وقت بڑی مشکل پیش آتی۔ اچھا، بیٹا تم یہاں ٹھہرو۔ میں قلعے میں جا کر بٹوا لے آؤں۔ تُمھارا نام کیا ہے، بیٹا؟

کامران نے کہا "جی کامران۔" "بڑا پیارا نام ہے۔" یہ کہہ کر شکاری قلعے کے پُرانے دروازے کی طرف بڑھا۔ پھر چند قدم چل کر رُک گیا، کامران کی طرف پلٹ کر دیکھا اور بولا "بیٹا، تم بھی میرے ساتھ آجاؤ۔ بارش شروع ہو گئی ہے۔ دو منٹ رُک کر چلے چلیں گے۔ میں تمھیں گرما گرم چائے اور کیک کھلا سکتا ہُوں۔ دُوسری کوئی چیز ابھی تیّار نہیں ہوگی۔ نوکر کھانا ذرا دیر سے پکاتا ہے۔"

بارش بھی کچھ تیز ہو گئی تھی۔ کامران نے سوچا کہ چلو، تھوڑی دیر شکاری انکل کے پُرانے قلعے کی سیر کر لیتے ہیں۔ وہ اکیلا رات کے اندھیرے میں اس علاقے میں سفر کر بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ گھوڑے سے اُتر پڑا اور شکاری کے ساتھ پُرانے قلعے کے دروازے میں داخل ہو گیا۔ قلعے کے اندر ایک ڈیوڑھی تھی۔ ڈیوڑھی میں بھی ایک لالٹین جل رہی تھی۔ وہاں کوئی چوکیدار تک نہ تھا۔ شکاری نے مسکراتے ہوئے کہا:

"کامران، بیٹا، یہاں بجلی نہیں ہے۔ مگر میرے پاس لالٹینیں کافی ہیں اچھا، یہ بتاؤ، تم چائے کون سی پیو گے؟ نمکین یا کالی؟

کامران نے کہا "جی، کوئی بھی ہو، پی لُوں گا۔"

ڈیوڑھی ختم ہوئی تو آگے ایک تنگ راستہ آگیا جس کے دونوں طرف اُونچی کالی دیواریں تھیں۔ اِس کے بعد ایک زینہ تھا جس کے دونوں طرف لالٹینیں جل رہی تھیں۔ شکاری اب کامران کے آگے آگے چلنے کی بجائے اُس کے بالکل ساتھ لگ کر چل رہا تھا۔ راہ داری کے آخر میں ایک تنگ دروازہ تھا۔ شکاری کامران کو ساتھ لے کر ایک چھوٹے سے کمرے میں آگیا۔ اس کمرے کی دیواریں بھی سیاہ تھیں۔ پُرانے صوفوں پر بھی سیاہ کپڑا چڑھا ہُوا تھا جس کی وجہ سے دیوار کے ساتھ لگی ہوئی لالٹین کی روشنی بہت کم ہو گئی تھی۔ ایک طرف دیوار میں کھڑکی تھی جس میں لوہے کی موٹی سلاخیں لگی ہُوئی تھیں۔ کامران کو یہاں آتے ہی خوف محسُوس ہُوا۔ مگر شکاری انکل اُس سے بڑی شفقت کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔

"بیٹا، میرا گھر بہت پُرانا ہو گیا ہے۔ مگر باپ دادا کی نشانی ہے۔ اِسے چھوڑنا نہیں چاہتا۔ تم بیٹھو، میں تمھارے لیے چائے کا کہہ کر آتا ہُوں۔" پھر اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھ کر بولا "صرف دس منٹ میں چائے پی کر یہاں سے چلے چلیں گے۔ میں اپنا بٹوا بھی لے آؤں گا۔"

اُس نے بڑی شفقت سے کامران کے سر پر ہاتھ پھیرا اور دروازے سے نکل گیا۔ جاتے ہُوئے وہ دروازے کو بند کرتا گیا تھا۔ اُس کے جانے کے بعد کامران نے پھٹی پھٹی دہشت زدہ آنکھوں سے کمرے کی چھت اور دیواروں کو دیکھا۔ اُس کی چھٹی حس اُسے بتا رہی تھی کہ یہاں اُس کے لیے

خطرہ ہے۔ اُسے بھاگ جانا چاہیے۔ پھر خیال آیا کہ کیا خطرہ ہو سکتا ہے۔ انکل شکاری تو اُس کے ساتھ بڑی محبت اور شفقت کا سلوک کر رہے ہیں۔ وہ اُٹھ کر سلاخوں والی کھڑکی کی طرف بڑھا، یہ دیکھنے کے لیے کہ دُوسری طرف کیا ہے۔ ابھی اُس نے قدم اُٹھایا ہی تھا کہ کھڑکی کی سلاخوں کے پیچھے ایک زرد رنگ کا چہرہ نمودار ہُوا۔ یہ ایک جھُرّیوں بھرا مرد کا چہرہ تھا جس کی آنکھوں میں خوف اور دہشت کے سائے لہرا رہے تھے۔

کامران ڈر کر وہیں رُک گیا۔

زرد چہرے نے گھُور کر کامران کو دیکھا اور کھڑکھڑاتی آواز میں آہستہ سے کہا " اب بھی وقت ہے۔ یہاں سے بھاگ جاؤ!"
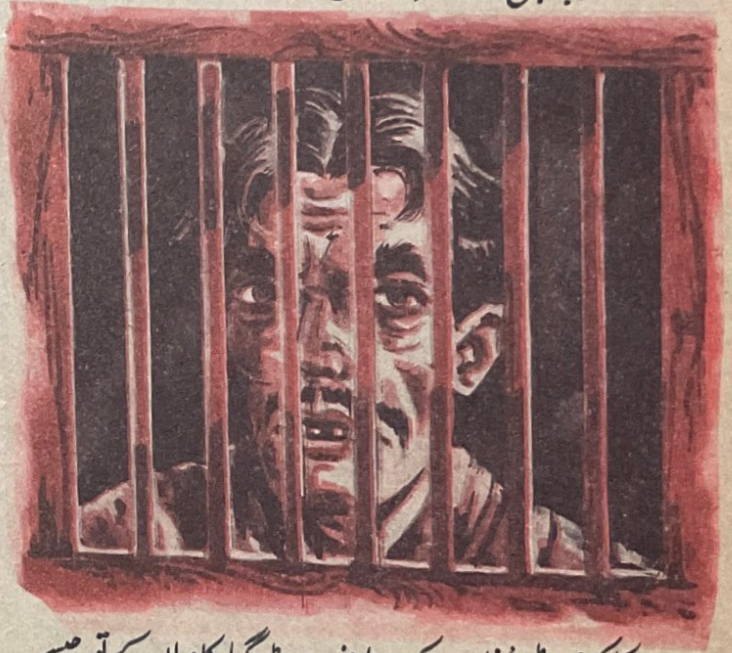
یہ کہہ کر زرد ڈراؤنا چہرہ ایک طرف ہٹ گیا۔ کامران کے تو جیسے کسی نے پاؤں پکڑ لیے۔ اُسے محسوس ہُوا کہ وہ اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتا۔ ڈراؤنے چہرے کی بات اُس نے سُن لی تھی۔ ہاں، اُسے یہاں سے بھاگ جانا چاہیے۔ کوئی خطرہ ضرور ہے جس کی سرگوشیاں اُس نے اس منحوس قلعے میں داخل ہوتے ہی سُن لی تھیں۔ وہ ہمت کر کے دروازے کی طرف بڑھا اور اُسے کھولنا چاہا۔ مگر وہ باہر سے بند تھا۔ کامران کا دل ڈُوبنے لگا۔ اتنے میں باہر راہ داری کے فرش پر کسی کے قدموں کی چاپ سُنائی دی۔ وہ واپس آ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ دروازہ کھُلا اور شکاری اندر داخل ہُوا۔ اُس کے ہاتھ میں چائے کی ٹرے تھی۔ وہ مُسکراتے ہُوئے بولا:

" کامران، بیٹے۔ مجھے زیادہ دیر تو نہیں ہوگئی؟ میں تمھارے لیے خود چائے بنا کر لایا ہوں۔ نوکر کہیں چلا گیا ہے۔"

اُس نے چائے کی ٹرے میز پر رکھ دی اور پیالیوں میں چائے بناتے ہُوئے بولا " باہر تو بڑی زبردست بارش ہو رہی ہے۔ خیر، کوئی بات نہیں ہم چھتریاں لے لیں گے۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ مجھے بھی شہر ضروری پہنچنا ہے۔ لو، چائے پیو۔"

شکاری نے چائے کی پیالی کامران کو تھما دی۔ کامران کا خوف شکاری کی باتوں سے کسی حد تک دُور ہو گیا۔ اُس نے سوچا کہ ڈراؤنے چہرے والا آدمی ضرور کوئی دیوانہ ہوگا۔ شکاری انکل میں کوئی خطرناک بات معلوم نہیں دیتی۔ یہ تو بڑے شفیق انکل ہیں۔ شکاری بھی اب کچھ زیادہ پیار محبت کی باتیں کرنے لگا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا:

" کامران، میری بڑی خواہش تھی کہ میرا بھی ایک بیٹا ہوتا تمھاری طرح نیک اور شریف۔ لیکن قدرت کو شاید یہ منظور نہ تھا۔ میری بیوی بے اولاد ہی فوت ہو گئی۔ پھر میں نے دُوسری شادی نہ کی اور اِس پُرانے قلعے میں اُٹھ آیا ...."

کامران آہستہ آہستہ چائے کے گھُونٹ بھرتے ہُوئے شکاری کی باتیں بڑے غور سے سُن رہا تھا اور وہ کامران کی طرف ٹکٹکی باندھ کر کہہ رہا تھا: " اپنے باپ دادا کے وقت کے اِس قلعے میں آ کر میں نے ایک نیا کھیل کھیلنا شروع کر دیا۔ میں کسی طرح اپنا دل بہلانا چاہتا تھا۔ میں نے اپنے ایسے کچھ لوگوں کو ساتھ مِلا کر ایک خُفیہ گروہ بنایا اور ایک ایسا سنسنی خیز، رونگٹے کھڑے کر دینے والا زندہ کھیل شروع کیا کہ جب تم اس کھیل کو دیکھو گے تو تمھارے بھی رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے۔ تم میری باتیں سُن رہے ہو ناں، کامران؟"

چائے میں جو بے ہوشی کی دوا تھی، اُس نے کامران پر اثر کر دیا تھا۔ پیالی اُس کے ہاتھ سے چھُوٹ کر نیچے گر پڑی۔ اُس کے ذہن میں سلاخوں کے پیچھے نمودار ہونے والے چہرے کے الفاظ گُونجے:

" اب بھی وقت ہے۔ یہاں سے بھاگ جاؤ!"

مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ کامران صوفے پر گر کر بے ہوش ہو چکا تھا۔

اِس کے بعد کیا ہُوا؟ شکاری کا رونگٹے کھڑے کر دینے والا سنسنی خیز کھیل کیا تھا؟ کامران پر کیا بیتی؟ اُس کے پیچھے لگے ہُوئے سانپ کہاں چلے گئے تھے؟ یہ جاننے کے لیے "پُراسرار نقاب پوش" کی اگلی قسط تعلیم و تربیت کے اگلے شمارے میں پڑھیے۔

رات کافی سرد تھی۔ آیا ماں نے رابعہ اور نبیل کو دُودھ پلایا اور بستروں پر لِٹا کے گرم کمبل اوڑھا دیے۔ پھر اُس نے باری باری دونوں کے ماتھے چُومے اور کہا: "اُب سو جاؤ، اچھے بچّوں کی طرح۔ رات بُہت ہو گئی ہے۔"

"نہیں آیا ماں، ہم تو پاپا کا انتظار کریں گے" رابعہ نے کہا۔ "اور مَیں بھی" نبیل نے بہن کی ہاں میں ہاں مِلائی۔ "نہیں بیٹا" آیا ماں نے پیار سے کہا "ڈاکٹر صاحب آج کل بُہت دیر سے آتے ہیں۔ تمھیں پتا ہے نا، شہر کے حالات کتنے خراب ہیں۔ پاکستان کے دُشمن اندھا دُھند فائرنگ کر کے بے گُناہ لوگوں کو مار رہے ہیں۔ ڈھیروں زخمی ہسپتالوں میں پڑے ہیں۔ تُمھارے پاپا اُن کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ تم سو جاؤ۔ شاباش!"

آیا ماں نے دونوں کے کمبل دُرست کیے اور خود بھی اُن کے ساتھ والے بستر پر سونے کے لیے لیٹ گئی۔

دِن بھر کی تھکی آیا ماں تھوڑی دیر بعد ہی گہری نیند سو رہی تھی۔ رابعہ اور نبیل نے ایک دُوسرے کی طرف دیکھا۔ دونوں کی آنکھوں سے نیند کوسوں دُور تھی۔ جب سے اُن کی اِمّی کا انتقال ہُوا تھا، وہ دونوں پاپا کے ساتھ سونے کے عادی تھے۔ رابعہ ایک طرف ہوتی تو نبیل دُوسری طرف۔ پاپا ہر روز ہسپتال سے جلدی گھر آ جاتے اور اُن کے ساتھ کھانا کھاتے۔ لیکن آج کل وہ بُہت دیر سے گھر لوٹتے تھے۔ اکثر وہ دونوں سو چکے ہوتے۔ صُبح اُٹھ کر پاپا اُنھیں بُہت پیار کرتے، ناشتا اُن کے ساتھ کرتے اور خود دونوں کو سکول چھوڑنے جاتے اور وہیں سے ہسپتال چلے جاتے۔

رابعہ اور نبیل ہر روز کوشش کرتے کہ پاپا کے اِنتظار میں جاگتے رہیں لیکن اُنھیں ہمیشہ نیند آ جاتی۔ آج بھی وہ جاگنے کے لیے باتیں کر رہے تھے۔ سرگوشیوں میں۔ تاکہ آیا ماں نہ جاگ جائے۔ دیر تک دونوں جاگتے رہے۔ اُنھیں نیند بالکل نہیں آ رہی تھی۔

یکایک نبیل نے آہستہ سے کہا "شِش۔ رابی۔ ذرا غور سے سُنو۔ تُمھیں کوئی آواز آ رہی ہے؟"

رابعہ نے کان باہر کی سَمت لگائے اور پریشان ہو کر بولی "ہاں، یُوں لگتا ہے جیسے کوئی کراہ رہا ہو۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ باہر کوئی زخمی پڑا ہو؟"

نبیل جلدی سے کمبل اُتار کے اُٹھ کھڑا ہُوا اور بولا "ہمیں دیکھنا چاہیے، رابی۔"

"مگر بھیا۔ ہم کر کیا سکتے ہیں؟" رابعہ نے بے بسی سے کہا۔

"ہم پاپا کو فون کر کے تو بُلا سکتے ہیں نا" نبیل نے عقل کی بات کی۔

"اچھا تو پھر آؤ۔ دیکھتے ہیں" رابعہ نے کہا۔

دونوں کمرے سے باہر نِکلے۔ کراہنے کی آواز تیز ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی گیٹ پر ہلکی ہلکی دستک کی آواز سُنائی دی۔

"کون ہے؟" نبیل نے گیٹ کے پاس جا کر پُوچھا۔

"دروازہ کھولو، بیٹا" ایک کانپتی ہُوئی آواز آئی "میرے بیٹے کی حالت

بہت خراب ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو دِکھانا ہے۔"

"مگر ہمارے ابُو تو گھر پر نہیں ہیں" رابعہ نے کہا۔

"ہمارا بچّہ سردی سے مر جائے گا، بیٹا۔ ہمیں اندر بُلا لو" وہی آواز پھر آئی۔

"میرا خیال ہے، ہمیں اِنھیں اندر بُلا لینا چاہیے۔ پاپا کو فون کر دیں گے" نبیل نے کہا اور آگے بڑھ کے گیٹ کھول دیا۔ دو تین دیہاتی سے لوگ اندر داخل ہُوئے۔ اُنھوں نے ایک آدمی کو پکڑ رکھا تھا۔

"آؤ، اندر کمرے میں آجاؤ" نبیل نے گیٹ بند کرتے ہُوئے کہا۔

"اِسے کیا ہُوا؟" رابعہ نے ہمدردی سے پوچھا۔

"دِل کا دورہ پڑا ہے، بیٹا" ایک اَدھیڑ عُمر سا آدمی، جِس کے بال کُچھ سفید تھے، کانپتی آواز میں بولا۔ دو اور آدمی بوڑھے کے بیٹے کو سہارا دیے ہوئے تھے۔

"آؤ، آؤ۔ اندر آجاؤ" نبیل نے کہا "مگر ذرا آہستہ۔ ہماری آیا سو رہی ہے۔"

وہ سب اندر آگئے۔ نبیل نے بیمار کو اپنے بستر پر لِٹا کے اُسے اچھّی طرح کمبل اوڑھا دیا۔

"میں دُودھ گرم کر کے لاتی ہُوں، بھیّا۔ تم جلدی سے پاپا کو فون کر دو۔" رابعہ نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی تاکہ باورچی خانے میں جا کر دُودھ گرم کر سکے۔

آیا ماں اُسے کبھی باورچی خانے میں نہیں جانے دیتی تھی۔ مگر وہ سمجھتی تھی کہ دُودھ گرم کرنا کوئی اتنا مشکل کام نہیں ہے۔ اُس نے فِرِج میں سے دُودھ نِکالا۔ پھر کوکنگ رینج کو آن کر کے دُودھ کا برتن اُس پر رکھ دیا۔ اِس کے بعد ایک بڑے گلاس میں چمچ سے چینی ڈالی اور تھوڑی دیر بعد چُولھا آف کر کے دُودھ گلاس میں ڈال دیا۔ پھر چمچ سے چینی گھول کر گلاس اُٹھائے کِچن سے باہر نکل آئی۔ لیکن کمرے میں داخل ہوتے ہی اُس کے مُنھ سے ایک چیخ نکلی اور دُودھ کا گلاس اُس کے ہاتھ سے گِرتے گِرتے بچا۔ کمرے کا منظر ہی کُچھ ایسا تھا کہ رابعہ کی آنکھیں خوف سے بُری طرح پھیل گئیں۔

وہ اَدھیڑ عُمر کا آدمی جس کی آواز کانپ رہی تھی، اب پستول ہاتھ میں لیے اکڑا کھڑا تھا۔ آیا ماں کے ہاتھ پیچھے بندھے تھے اور مُنھ میں کپڑا ٹُھنسا ہُوا تھا۔ نبیل ٹیلی فون کے پاس کھڑا تھا۔ اُسے بھی ایک آدمی نے پکڑ رکھا تھا اور وہ بیمار جسے وہ بستر پر لیٹا چھوڑ گئی تھی، چوتھے آدمی کے ساتھ جلدی جلدی کمرے کا قیمتی سامان اکٹھا کر رہا تھا۔ کلر ٹی وِی، ٹیپ ریکارڈر، اُن کے قیمتی کِھلونے، گھڑیاں، وال کلاک، ٹائم پیس۔ رابعہ کے اندر آتے ہی اَدھیڑ عُمر کا آدمی لپک کر اُس کے پاس آیا اور پستول کنپٹی سے لگاتے ہوئے بولا "خبردار! جو آواز نکالی۔"

رابعہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اگر یہ ڈاکُو ہیں تو اپنے بیمار ساتھی سے کام کیوں لے رہے ہیں! اُس پر تو دِل کا دَورہ پڑا تھا۔ اگر وہ زیادہ بیمار ہو گیا اور مر گیا تو؟

وہ لوگ سامان سمیٹ چُکے تو اَدھیڑ عُمر کے آدمی نے حُکم دیا "جلدی کرو! سارا سامان گاڑی میں رکھو!"

یکایک رابعہ بول پڑی "ڈاکو انکل۔ آپ ہمارا سارا سامان لے جائیں مگر اپنے بیٹے سے کام تو نہ کروائیں۔ یہ بیمار ہے۔ اگر یہ مر گیا تو ؟"

ڈاکو نے مڑ کر اُس کی طرف دیکھا۔ دُودھ کا گلاس ابھی تک اُس کے ہاتھ میں تھا۔

"یہ دُودھ تو پی لینے دیں اس کو" رابعہ نے پھر کہا۔

ڈاکو کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا اور پھر یکایک اُس کا پستول نیچے ہو گیا۔ اُس نے اپنے آدمیوں کو رُکنے کا اشارہ کیا اور بولا:

"بچّوں کے کھلونے یہیں رکھ دو۔" پھر اُس نے نبیل سے کہا "آیندہ دروازہ سوچ سمجھ کر کھولا کرو، بیٹے۔"

"میں نے سوچا تھا" نبیل مسکراتے ہُوئے بولا "اگر باہر ڈاکو ہُوئے تو کیا ہو گا؟"

"پھر تم نے دروازہ کیوں کھول دیا؟" ایک ڈاکو حیرت سے بولا۔

"میں نے سوچا، اگر واقعی کوئی زخمی یا بیمار ہُوا اور ہم نے دروازہ نہ کھولا تو کیا ہو گا؟" نبیل نے کہا۔ سارے ڈاکو خاموشی سے ایک دُوسرے کا مُنھ تکنے لگے۔

"ہاں ہم سے ایک بے وقوفی ضرور ہُوئی" نبیل نے کُچھ سوچ کر کہا "ہمیں پہلے اپنے پاپا کو فون کرنا چاہیے تھا۔ وہ پانچ منٹ میں آجاتے۔ مگر میں نے سوچا ضرور تھا، سمجھا نہیں تھا۔ آیندہ سوچ سمجھ کے دروازہ کھولا کروں گا۔"

سارے ڈاکو باہر نکل گئے۔ بے چاری آیا ماں ابھی تک بندھی پڑی تھی اور مُنھ سے اُوں اُوں کی آوازیں نکال رہی تھی۔

1941 کا سال تھا۔ دُوسری جنگِ عظیم شروع ہُوئے دو سال ہو چکے تھے۔ دُوسرے مُلکوں کی طرح اِنگلستان میں بھی خوراک کی کمی تھی۔ لیکن خوش قسمتی سے اِس سال گاجر کی فصل بہت اچھی ہوئی تھی اور حکومت چاہتی تھی کہ لوگ زیادہ سے زیادہ گاجریں کھائیں۔ لیکن سوال یہ تھا کہ گاجر کھانے پر لوگوں کو آمادہ کس طرح کیا جائے!

آخر انگلستان کے وزیرِ خوراک کو ایک ترکیب سُوجھی۔ اس نے ملک میں یہ افواہ پھیلادی کہ انگریز ہوا باز گاجر کھاتے ہیں، جس سے اُن کی نگاہ بہت تیز ہو گئی ہے اور وہ رات کے اندھیرے میں بھی جرمنوں کے فوجی ٹھکانوں پر ٹھیک ٹھیک نشانے لگاتے ہیں۔ تو صاحب! یہ افواہ پھیلنا تھی کہ انگریزوں نے دھڑا دھڑ گاجریں کھانا شروع کر دیں اور گوشت، انڈے، مچھلی اور اناج کی کافی بچت ہو گئی۔

گاجر بہت مُفید سبزی ہے۔ یہ کچّی بھی کھائی جاتی ہے اور پکا کر بھی۔ لیکن کچّی زیادہ فائدہ مند ہے۔ اب یہ تو ٹھیک سے پتا نہیں کہ اِس کا اصل وطن کون سا ہے اور سب سے پہلے یہ کس عِلاقے میں کاشت کی گئی، لیکن اِتنا پتا ہے کہ اِنسان اِسے صدیوں سے اِستعمال کر رہا ہے اور یہ دُنیا کے تقریباً تمام مُلکوں میں بوئی اور کھائی جاتی ہے۔

آج سے 68 سال پہلے تک لوگ گاجریں صرف پیٹ بھرنے کے لیے کھاتے تھے اور اِس کے فائدوں سے بے خبر تھے۔ 1920 کے لگ بھگ سائنس دانوں نے دریافت کیا کہ گاجر میں ایک خاص چیز پائی جاتی ہے جسے "کیروٹین" کہتے ہیں۔ جب کیروٹین اِنسان کے جگر میں پہنچتی ہے تو وائٹامن اے میں بدل جاتی ہے اور وائٹامن اے نگاہ کے لیے بہت مُفید ہے۔

وائٹامن اے ہماری جِلد کے لیے بھی فائدہ مند ہے۔ یہ جِلد کو بہت سی بیماریوں سے بچاتا اور اُسے تن دُرست رکھتا ہے۔ وائٹامن اے کے عِلاوہ گاجر میں معدنی نمک، کیلسیم اور کئی دُوسرے وائٹامن (خاص کر وائٹامن سی) بھی پائے جاتے ہیں۔ اِسی لیے ڈاکٹر گُردے اور جگر کے مریضوں کو گاجر کھانے کی تاکید کرتے ہیں۔ اور دمے کے مریض کے لیے تو یہ اکسیر ہے۔

پس آپ آج ہی سے روزانہ، مُختلف اوقات میں، دو گاجریں ضرور کھائیے۔ چند ہفتوں میں آپ کی نگاہ بھی تیز ہو جائے گی اور آپ جسم میں نئی قُوّت بھی محسوس کریں گے۔ لیکن گاجر کو چھیلیے نہیں۔ چھیلنے سے اِس کے بہت سے وائٹامن اور نمک ضائع ہو جاتے ہیں۔ بس ایسے ہی دھو کر اور خُوب چبا چبا کر کھائیے۔ (س۔ل)

خُون بہنا

ڈاکٹر سیّد شعیب شاہ

فوری صدمہ

آج ہم بطورِ خاص اُس صدمے کا ذکر کریں گے جس کے تحت دورانِ خون کا نِظام جو انسانی جسم کو آکسیجن پہنچاتا ہے، فیل ہو جاتا ہے۔ دورانِ خون کا نظام فیل ہو جانے کی یُوں تو بُہت سی وجُوہات ہیں لیکن ہم اِن کو دو بڑے حصّوں میں تقسیم کر سکتے ہیں :

اوّل : دِل کے پٹّھے کمزور پڑ جاتے ہیں جس کی وجہ سے شریانوں میں خون کا دباؤ کم ہو جاتا ہے اور بعض اوقات دِل کی دھڑکن بھی بند ہو جاتی ہے۔

دوم : جسم میں خُون کی مقدار میں شدید کمی واقع ہو جاتی ہے جس کے سبب جسم کے خلیوں کو آکسیجن مُہیا نہیں کی جا سکتی۔

خون کی مِقدار میں کمی دو طرح سے ہوتی ہے : ایک تو کسی زخم کی وجہ سے جسم سے باہر خون کا اخراج ہوتا ہے۔ دُوسرے کسی اندرونی زخم کی وجہ سے جسم کے اندر خون ضائع ہو جاتا ہے۔ جسم میں خون کی شدید کمی کے باعث صدمے کی جو علامات ظاہر ہوتی ہیں، وہ درجِ ذیل ہیں :

1. حادثے یا صدمے کے شکار شخص کی رنگت زرد ہو جاتی ہے۔
2. ٹھنڈے پسینے آتے ہیں۔
3. عملِ تنفُّس تیز ہو جاتا ہے۔
4. حادثے کا شکار شخص مُضطرب ہوتا ہے اور اُتھلے سانس لیتا ہے۔
5. آخر میں، اگر مناسب طبّی امداد فراہم نہ کی جائے تو حادثے کا شکار شخص ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے۔ اِس سے موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔

اِحتیاطی تدابیر

1. اِخراجِ خُون کو جتنی جلد ممکن ہو سکے، روکا جائے۔
2. حادثے کے شکار شخص کو کم سے کم ہِلایا جُلایا جائے اور شدید سردی اور گرمی کے اثر سے بچایا جائے۔
3. اُسے لِٹا دیا جائے اور پاؤں کے نیچے کوئی چیز رکھ کر انھیں اُونچا کر دیا جائے۔
4. اُسے جہاں تک ممکن ہو سکے، گرم رکھا جائے۔
5. فوری طبّی امداد کے لیے ہسپتال سے رجُوع کیا جائے۔

چھوٹے زخم اور خراشیں

اِنسانی جِلد کے کٹنے پھٹنے یا اُس پر خراش آنے یا رگڑ لگنے کی صُورت میں جراثیم زخم میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اِس کے علاوہ زخم پر مکھیوں وغیرہ کا بیٹھنا اور گندے ہاتھوں کا لگنا بھی زخم کو خراب کر سکتا ہے۔ لہٰذا ایسے زخموں کا علاج

کرتے وقت یہ چیز ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ایک تو زخم کو صاف رکھا جائے دوسرے اُسے کسی چیز سے ڈھانپ دیا جائے تاکہ جراثیم اُس پر اثر انداز نہ ہو سکیں۔ ایسے زخموں کے علاج کے لیے جن چیزوں کی فوری ضرورت ہوتی ہے، وہ درجِ ذیل ہیں:

1. مختلف پٹیاں۔
2. صاف پانی اور صابن۔
3. جراثیم کُش دوائیں اور صاف رُوئی۔

احتیاطی تدابیر

1. حادثے کے شکار شخص کو فوراً اٹھا کر زخم کو پٹی سے ڈھانپ دیا جائے۔
2. تمام ضروری اشیا جن کا اُوپر ذکر کیا گیا ہے، جمع کرلی جائیں اور ان چیزوں اور زخم پر کھانسنے سے پرہیز کیا جائے۔
3. اگر زخم گندہ ہو تو اُسے تیز بہتے پانی سے دھویا جائے اور جراثیم کُش دوائی سے صاف کیا جائے۔ اگر زخم پر کھرنڈ بن چکا ہو تو اُسے نہ چھیڑا جائے۔ ایسا کرنے سے خُون کے دوبارہ بہنے کا خطرہ ہوتا ہے۔
4. اگر شیشے کا کوئی ٹکڑا وغیرہ زخم میں اٹکا رہ جائے تو احتیاط سے اُسے

نکال دینا چاہیے۔

5. زخم کے اِردگرد کا حصہ خشک کرنے کے بعد اُس پر پٹی باندھ دی جائے۔
6. زخمی حصے کو آرام دیا جائے۔

پٹیوں کی اقسام

پٹیاں عام طور پر دو طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک تو جراثیم سے پاک پٹیاں جو بڑے زخموں پر لگائی جاتی ہیں۔ دُوسرے چپکنے والی پٹیاں جو چھوٹے زخموں یا خراشوں کے لیے اِستعمال ہوتی ہیں۔

جراثیم سے پاک پٹی

یہ پٹی دو تہوں پر مشتمل ہوتی ہے اور دونوں تہوں کے درمیان رُوئی ہوتی ہے، جو پیڈ کے طور پر کام کرتی ہے۔ یہ پیڈ جراثیم سے پاک ہوتے ہیں۔ اِس کے اُوپر باندھنے کے لیے ایک اور پٹی ہوتی ہے۔ یہ سب کچھ ایک جراثیم سے پاک لفافے میں بند ہوتا ہے۔

لفافے کو کھولنے کے بعد کوشش کریں کہ پٹی کو کم سے کم ہاتھ لگایا جائے۔ پیڈ کے ٹکڑے کو کنارے سے پکڑتے ہوئے زخم کے اُوپر رکھیں اور اِس کے اُوپر گھومنے والی پٹی لپیٹتے ہوئے گرہ لگادیں۔ کوشش کریں کہ پیڈ کو ہاتھ نہ لگے۔

چپکنے والی پٹی

دُوسرے لفظوں میں اِسے پلستر بھی کہتے ہیں۔ یہ پٹی ایک چھوٹے سے پیڈ پر مشتمل ہوتی ہے، جس کے دونوں کناروں پر چپکنے والا مادّہ لگا ہوتا ہے۔ یہ پٹی بھی جراثیم سے پاک لفافے میں بند ہوتی ہے۔

اُس پیڈ کو جو پٹی کے درمیانی حصے پر چپکا ہوتا ہے، زخم پر رکھ کر پٹی کے باقی حصے کو جسم پر چپکا دینا چاہیے۔ جسم کے جس حصے پر پٹی لگانا مقصود ہو، وہ مکمّل طور پر خشک ہو۔

ہنگامی پٹیاں

اگر آپ کے پاس ایسی پٹیاں نہ ہوں تو رُومال، دوپٹے، چادر کے ٹکڑے، ٹشو پیپر وغیرہ کو ہنگامی پٹی کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔

پہلے ہاتھ دھوئیں پھر جس چیز سے پٹی کی جانا مقصود ہو، اُس کو اُلٹ لیں کیونکہ اُلٹنے سے صاف حصّہ جسم کی طرف آجائے گا۔ اِس کے بعد اُسے جسم کے مُتاثرہ حصّے پر باندھ دیں۔

کشتی اُلٹ گئی

خدیجہ طلعت

بپھرے ہوئے سیلاب نے جانے کتنے گھروں کو برباد کیا تھا، کتنی جانیں ضائع ہوئی تھیں، اور کتنے لوگ بے آسرا ہو گئے تھے۔ پانی کے ریلے میں بے جان سامان اور جانوروں کے ساتھ انسان بھی بہے جا رہے تھے۔

پانی کا چڑھاؤ ذرا کم ہُوا تو امدادی پارٹیاں کشتیوں میں سیلاب زدہ علاقے سے لوگوں کو بھر بھر کے لانے لگیں۔ بہت سے پُختہ مکان ایسے تھے جن کے در و دیوار سلامت تھے لیکن پانی بھر جانے کی وجہ سے سارا سامان تباہ ہو چکا تھا اور گھر کے مکینوں نے چھتوں پر چڑھ کر اپنی جانیں بچائی تھیں۔ ایسے لوگوں کو اِمدادی پارٹیاں کھانے پینے کا سامان پہنچا رہی تھیں۔ لیکن ایسے مکان جن کی ایک اینٹ بھی سیلاب کے ظالم پانی نے باقی نہ چھوڑی تھی، اُن کے مکینوں کو امدادی پارٹیاں کشتیوں کے ذریعے محفوظ علاقوں میں پہنچا رہی تھیں۔

ایسی ہی ایک کشتی میں راشد بھی تھا۔ وہ راشد جو کبھی بھرے پُرے گھر کا لاڈلا بیٹا تھا، آج یُوں بے سروسامانی کے عالم میں اُجڑا ہُوا پڑا تھا۔

صِرف ایک دن پہلے کی بات تھی۔ اُس کے ابّو حامد علی جو دُوسرے شہر میں مُلازمت کرتے تھے، گھر آئے ہُوئے تھے۔ امّی اور سارے بہن بھائی خوش تھے۔ گھر میں دعوت کا سا سماں تھا۔ باورچی خانے سے طرح طرح کے کھانوں کی خوشبوئیں اُٹھ رہی تھیں۔ اُس کی امّی ایسے دن خاص طور سے کھانوں کا اہتمام کرتی تھیں۔ وہ اور اُس کے بہن بھائی ابّو کے گرد بیٹھے تھے اور مہینے بھر کے قِصّے اُنھیں سُنا رہے تھے۔ پھر امّی نے کھانا لگ جانے کی اِطّلاع دی اور سب نے مل کر کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد بھی ابّو دیر تک سب بچّوں سے باتیں کرتے رہے۔

پھر اچانک محلّے کی مسجد سے اِعلان ہونے لگا کہ سیلاب آنے والا ہے۔ لوگ اپنے بچاؤ کا انتظام کر لیں۔ امّی ابّو گھبرا گئے اور جلدی جلدی گھر کا سامان سمیٹنے لگے۔ اُن کا گھر نشیبی علاقے میں تھا۔ آج سے 34 سال پہلے جب راشد کے ابّو گیارہ بارہ سال کے تھے، جب بھی سیلاب نے تباہی مچائی تھی اور اُن کے گھر کا بہت سا قیمتی سامان ضائع ہو گیا تھا۔ اِس بار اُنھوں نے تمام سامان اُوپر نیچے اِس طرح رکھا کہ پانی کمروں میں بھرے بھی تو سامان تک نہ پہنچ سکے۔ کچھ سامان وہ لوگ اپنے ساتھ چھت پر لے گئے اور وہاں بیٹھ کر اس آفت سے بچاؤ کی دُعائیں مانگنے لگے۔

زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ پانی شور مچاتا ہُوا اُن کی گلی میں داخل ہُوا اور گھر کے اندر بھرنے لگا۔ سب بچّے خوف زدہ تھے۔ امّی ابّو دُعائیں مانگ رہے تھے لیکن پانی کی سطح بڑھتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ وہ چھت تک آ پہنچا۔ امّی اور بچّے چیخنے لگے۔ ابّو بھی گھبرا گئے۔ لیکن کوئی بھی کچھ نہ کر سکا اور سیلاب کا ظالم پانی سب کو بہا کر لے گیا۔

پانی راشد کے حلق اور کانوں میں گھُستا چلا رہا تھا اور اُسے یُوں محسُوس ہو رہا تھا جیسے وہ مَر رہا ہو۔ لیکن اُسے ہوش آیا تو وہ ایک کشتی میں سوار تھا۔ اُس نے آنکھیں کھول کے چاروں طرف دیکھا۔ اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کو تلاش کیا۔ مگر یہ دیکھ کر اُس کا دل ڈُوبنے لگا کہ اُن میں سے کوئی بھی کشتی میں نہ تھا۔ دُکھ اور کمزوری نے اُسے نِڈھال کر دیا۔ اُسے ہوش میں دیکھ کے اِمدادی پارٹی کے آدمیوں نے اُسے کچھ کھلانے کی کوشش کی، جسے اُس نے بے دِلی سے کھایا اور پھر رونے لگا۔ ایک آدمی اُسے پیار سے تسلّی دے رہا تھا اور پانی کا زور تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اِمدادی پارٹی کے کارکُن بڑی مُشکل سے کشتی کو کنارے

کی طرف لے جانے کی کوشش کر رہے تھے کہ یکایک کشتی اُلٹ گئی اور پھر راشد کو کوئی ہوش نہ رہا۔

کچھ دیر بعد اُسے ہوش آیا تو اُس کے سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔ اُس نے بڑی مشکل سے آنکھیں کھول کے دیکھا۔ صبح ہو رہی تھی۔ وہ کانٹے دار جھاڑیوں میں اٹکا ہُوا تھا۔ بدبُو اِس قدر تھی کہ اُس کا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ تب ہی اُس نے دیکھا کہ اُس کے قریب جانوروں کی سڑی ہوئی لاشوں کے ساتھ ایک انسانی لاش بھی پڑی ہے۔ بدبُو انھی میں سے آ رہی تھی۔ خوف سے اُس کا حال خراب ہونے لگا۔ جانے وہ کتنے دن سے یہاں بے ہوش پڑا تھا۔ بھوک پیاس، تکلیف اور کمزوری نے اُس کے جسم سے ہلنے جُلنے کی طاقت چھین لی تھی۔ پھر کہیں قریب سے اُسے کسی کے کراہنے کی آواز آئی۔ کوئی اور بھی زندہ تھا۔ اُس نے جھاڑیوں میں سے خود کو نکالنے کی کوشش کی مگر اُس کے کپڑے کانٹوں میں پھنسے ہُوئے تھے۔ اُس نے پُوری طاقت سے زور لگایا۔ کانٹوں نے کپڑے پھاڑ دیے اور جسم کو زخمی کر کے اُسے نکلنے کی جگہ دے دی۔ وہ تقریباً گھسٹتا ہُوا جھاڑیوں میں سے نکل آیا اور پھر یہ دیکھ کر اُس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کہ سامنے جا بجا جانوروں اور انسانوں کی لاشیں پڑی ہیں۔ کچھ لوگ اُس کی طرح زندہ بھی تھے جو تکلیف اور بھوک پیاس سے کراہ رہے تھے۔

خود راشد کو بھی بھوک پیاس اور زخموں نے نڈھال کر رکھا تھا۔ اُس میں کھڑے ہونے کی طاقت نہ تھی۔ وہ جھاڑیوں کے نزدیک نڈھال پڑا رہا۔ جانے وہ کون سا علاقہ تھا۔ اُس نے نگاہ دوڑائی تو اُمید کی ایک کرن نظر آئی۔ دُور کہیں آبادی کے آثار تھے۔ لیکن اگلے ہی لمحے وہ مایوس ہونے لگا۔ بھلا کسی کو کیا خبر کہ یہاں کچھ مُصیبت زدہ لوگ پڑے ہیں!

"پانی! ــــ پانی! ــــ" وہ بڑبڑایا۔ کمزوری اتنی تھی کہ حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ مگر یہاں کون تھا جو اُسے پانی پلاتا۔ سب اُسی جیسے مصیبت زدہ لوگ تھے۔ اُس پر غنودگی طاری ہو گئی۔ شاید وہ پھر بے ہوش ہو رہا تھا۔

یکایک اُس کے ڈوبتے ذہن میں بے داری کا احساس پیدا ہُوا اور اُس کی ساری طاقت کانوں میں سمٹ آئی۔ دُور کہیں بہت سے دوڑتے قدموں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یقیناً کسی نے اُنھیں یہاں پڑے دیکھ لیا تھا۔ اور اب بہت سے لوگ اُن کی مدد کو آ رہے تھے۔ اُس نے چلّانے کی کوشش کی "پانی! ــــ پانی! ــــ" مگر حلق سے کمزور سی آواز نکل کر رہ گئی۔

لوگ اب نزدیک آ گئے تھے، اُس نے بند آنکھوں سے محسوس کیا پھر پُوری قوت جمع کر کے چلّانے کی کوشش کی "پانی! پانی!" مگر لوگ اُس کے آس پاس سے گزرتے رہے۔ اُس نے کوشش کر کے آنکھیں کھولیں اور پھر اگلے ہی لمحے اُس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ آنے والے لوگ مُصیبت زدہ لوگوں کی مدد کرنے کے بجائے اُنھیں لُوٹ رہے تھے۔ راشد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کِتنے خود غرض تھے وہ لوگ! مایوس ہو کر اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ جانتا تھا، اب کوئی اُس کی کلائی سے بھی گھڑی اُتارنے آئے گا لیکن شاید اُس کی گھڑی پر کسی کی نگاہ نہیں پڑی تھی۔ وہ سب لوگوں کو لُوٹ کر چلے گئے تھے۔

صُبح کی روشنی نمودار ہو رہی تھی۔ لوگوں کی کراہیں اور بچّوں کے رونے کی آواز اب بھی کبھی کبھی فضا کی خاموشی کو توڑ دیتی۔ یکایک فضا ایک بار پھر دوڑتے قدموں سے گونج اُٹھی۔ "شاید لُٹیروں کا کوئی دُوسرا گروہ آ رہا ہے۔" راشد نے سوچا۔ کمزوری، تکلیف اور بھوک پیاس سے اُس کی بُری حالت تھی مگر وہ آنکھیں بند کیے نڈھال پڑا رہا۔ اِس انتظار میں کہ اب کوئی اُس کی کلائی سے گھڑی اُتارنے آئے گا۔ اور پھر کوئی اُس کے نزدیک آ گیا۔ وہ جھکا اور پھر جیسے ہی اُس نے راشد کے ہاتھ کو چھُونے کی کوشش کی، اُس نے پُوری قوت جمع کر کے گھڑی والا ہاتھ آنے والے کے مُنھ پر مارا۔ آنے والا اُلٹ کے گر گیا۔ راشد بھی نڈھال ہو کر لیٹ گیا۔ اب اُس کے جسم میں ہلنے کی بھی طاقت

نہ تھی۔ آخر کار اُس نے آنکھیں کھول کے دیکھا۔ صبح کی روشنی پوری طرح پھیل چکی تھی۔ آنے والے اب بھی لوگوں پر جھکے ہُوئے تھے۔ حلق میں پڑنے والے کانٹوں سے مجبور ہوکر اُس نے پھر چلّانے کی کوشش کی "پانی! پانی!"

اور پھر یکایک وہ چونک گیا۔ پانی اُس کے نزدیک ہی پڑا تھا۔ یہ ایک ٹین کا جگ تھا جو جھاڑیوں میں گرا پڑا تھا۔ اُس میں سے پانی بہ بہ کر زمین میں جذب ہو رہا تھا۔ وہ دیوانوں کی طرح گھسٹتا ہُوا جگ تک گیا اور اُسے اٹھا کر مُنھ سے لگا لیا۔ پانی حلق سے اُترا تو اُس کے بدن میں کچھ طاقت آئی۔ وہ دُوسرے لوگوں سے قدرے فاصلے پر جھاڑیوں کے نزدیک پڑا تھا۔ اُس نے چاہا کہ اٹھ کر چھپ جائے تاکہ لوگوں کی نظر اُس پر نہ پڑے۔ تب ہی وہ زور سے چونک پڑا۔

اُس کے نزدیک ہی ایک لڑکا بے ہوش پڑا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ٹین کا گلاس تھا اور رُخساروں پر آنسوؤں کی لکیریں۔ راشد سمجھ گیا کہ اُس کے وار سے یہ لڑکا پتھروں پر گر کر بے ہوش ہُوا ہے۔ وہ شرم سے پانی پانی ہو گیا۔

اُس نے جلدی سے جگ اُٹھایا اور بچا کچھا پانی لڑکے کے چہرے پر چھڑکنے لگا۔ لڑکے نے آنکھیں کھول دیں۔

"مجھے معاف کر دو، میرے بھائی" راشد نے بڑے پیار سے کہا اور لڑکا مُسکرا دیا۔

اور پھر راشد نے دیکھا کہ آنے والے لوگوں کے چہروں پر محبت بھری مسکراہٹ ہے۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ لوگ سیلاب زدہ افراد کی مدد کے لیے آئے ہیں۔ اُن کے ہاتھوں میں کھانے پینے کی چیزیں اور دواؤں کے بکس تھے۔ وہ زخمیوں کی مرہم پٹّی کر رہے تھے اور انھیں کھانا کھلا رہے تھے۔ یہ نیک دِل لڑکا جسے وہ لُٹیرا سمجھا تھا، انھی میں سے ایک تھا۔

راشد نے آگے بڑھ کر لڑکے کو گلے لگا لیا، اور پھر وہ پلٹا تو دیکھا کہ اُس کے ابّو، امّی اور تینوں بہنیں کھڑی مُسکرا رہی ہیں۔ امدادی پارٹی نے اُن سب کو بچا لیا تھا۔ اُس کے مُنھ سے خوشی کی چیخ نکلی اور وہ دوڑ کر اُن سے لپٹ گیا۔

سچی بات

بے وقوف کوّا

ڈاکٹر عبدالرؤف

ایک بے وقوف کوّا اُڑتے اُڑتے ایک جھیل کی طرف آنکلا۔ اُس نے نیچے جو نگاہ ڈالی تو ایک سفید بطخ بڑے مزے سے جھیل میں تیرتی ہوئی دکھائی دی۔ کوّے نے گوری چٹی بطخ کو آزادی سے یُوں گھومتے پھرتے دیکھا تو اپنے آپ سے کہنے لگا: ”دیکھو تو! بی بطخ کس ٹھاٹھ سے پانی میں تیرتی پھرتی ہے مُسلسل پانی میں رہنے سے اِس کی رنگت بھی گوری ہو گئی ہے۔ اور مَیں، مَیں تو کالا کلوٹا بدصُورت سا پرندہ ہوں۔ اگر مَیں بھی بطخ کی طرح پانی میں رہنے لگوں تو ایک نہ ایک دن میرا رنگ بھی ضرور گورا ہو جائے گا۔ اور پھر بطخ کی طرح میں بھی مزے کروں گا۔“

یہ خیال آنا تھا کہ کوّا فوراً زمین پر اُتر آیا اور پھُدک کر جھیل میں ڈبکیاں لگانے لگا۔ اِسی بھاگ دوڑ میں اُسے سخت بھُوک بھی ستانے لگی۔ مگر پانی میں مچھلیوں کے سوا کُچھ بھی نہ تھا۔ خالی پیٹ پانی میں غوطے کھانے سے اُس پر کپکپی طاری ہو گئی۔ اُس کے پَر گیلے ہو چکے تھے اور وہ اُڑ کر اِدھر اُدھر سے دانہ دُنکا تلاش کرنے کے قابِل بھی نہ رہا تھا۔ آخر کنارے کی جانب لپک کر وہ بڑی مُشکل سے باہر نِکلا اور دُھوپ میں بیٹھ کر پَر سُکھانے لگا۔ سردی اور بھُوک سے اُس کا بُرا حال ہُوا جا رہا تھا۔

دُوسروں پر خواہ مخواہ رشک کرنے اور اُن کی بے سوچے سمجھے نقل کرنے کی اُسے بڑی سخت سزا مل چکی تھی۔

ایٹم

سعید لخت

اپنے اِرد گرد نظر دوڑائیے۔ آپ کو مختلف اشیا دکھائی دیں گی۔ کاغذ، لکڑی، دھاتیں، کپڑا، پلاسٹک، پتھر، اینٹیں، گھاس، درخت اور مٹی۔ اِن کے علاوہ ایسی شفاف چیزیں بھی ہوں گی جن کے آر پار آپ دیکھ سکتے ہیں۔ مثلاً شیشہ، ہوا اور پانی۔ یہ چیزیں کس چیز سے بنی ہیں؟ وہ کیا چیز ہے جس نے اِن چیزوں کو ایک دُوسرے سے مختلف شکل دی ہے؟ ان سوالوں کے جواب معلوم کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ آپ اِن چیزوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کیجیے اور پھر دیکھیے کہ اُن کے اندر کیا ہے۔ جب آپ اِن کے ٹکڑے کرتے چلے جائیں گے تو آخر میں اتنے ننھے ننھے ٹکڑے رہ جائیں گے جن کے مزید ٹکڑے کرنا ممکن نہ ہوگا۔ یہی ٹکڑے یا حصے ایٹم (ATOM) کہلاتے ہیں۔

ایٹم یونانی زبان کا لفظ ہے، جس کا مطلب ہے وہ چھوٹے سے چھوٹا ذرّہ جسے مزید نہ توڑا جا سکے۔ سب سے پہلے یُونان کے ایک عالم دِمقراطیس (DEMOCRITUS) نے تقریباً 2500 سال قبل دُنیا والوں کو یہ بتایا کہ دُنیا کی ہر چیز مادّے سے بنی ہے اور خود مادّہ ایٹموں سے بنا ہے۔

لیکن آپ محض چاقُو سے کسی چیز کو کاٹ کر ایٹم نہیں بنا سکتے۔ ایٹم بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔ اتنے چھوٹے اور ننھے ننھے کہ پانچ کروڑ ایٹم اُوپر تلے رکھے جائیں تو اُن کی اُونچائی صرف ایک سنٹی میٹر ہوگی۔ اب بھی آپ نہ سمجھے ہوں تو یُوں سمجھیے کہ اگر ایک ایٹم کو آپ کے ہاتھ کے برابر بڑا کیا جائے اور پھر اُس ہاتھ کو اتنا ہی بڑا کیا جائے جتنا بڑا ایٹم کو کیا گیا ہے تو آپ اس ہاتھ سے چاند کو چُھو سکیں گے۔

اگر ہم کسی طریقے سے مختلف چیزوں کے ایٹم دیکھ سکیں تو ہمیں اِن چیزوں میں مختلف قسم کے تقریباً ایک سو سے زائد ایٹم نہیں ملیں گے۔ بعض اشیا ایک ہی قسم کے ایٹموں سے بنی ہیں۔ یہ اشیا عناصر (ELEMENTS) کہلاتی ہیں۔ سونا ایک عنصر ہے، کیوں کہ اس میں صرف سونے کے ایٹم ہی ہوتے ہیں۔ تانبا اور چاندی کی دھاتیں بھی عناصر ہیں۔ ہائیڈروجن اور آکسیجن گیسیں اور سیاہ ٹھوس کاربن بھی عنصر ہیں۔ اب چُوں کہ دُنیا میں تقریباً سو مختلف قسم کے ایٹم ہیں، اس لیے عنصر بھی تقریباً سو مختلف قسم کے ہیں۔ ہم اپنے آس پاس جو چیزیں دیکھتے ہیں، اُن میں سے بہت سی چیزیں مختلف قسموں کے دو یا دو سے زائد ایٹموں سے بنی ہیں۔ مثال کے طور پر پانی، جو ہائیڈروجن اور آکسیجن کے ایٹموں سے بنا ہے۔ چینی یا شکر میں کاربن، ہائیڈروجن اور آکسیجن کے ایٹم ہوتے ہیں۔ اگر آپ پانی کے ایک قطرے یا شکر کے ایک ذرّے کو توڑ کر اِن کے ایٹم نکال سکیں تو آپ کو پانی کے ہائیڈروجن ایٹم اور شکر کے ہائیڈروجن ایٹم میں کوئی فرق دکھائی نہ دے گا۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر ہر چیز اُن ننھے ننھے ذرّوں سے بنی ہے، جنھیں ایٹم کہا جاتا ہے تو پھر ہر چیز ریت کے ذرّوں کی طرح بکھری ہُوئی کیوں نہیں ہوتی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایٹم ریت کے ذرّوں سے بھی بہت چھوٹے ہوتے ہیں اور ایک دُوسرے سے مضبُوطی کے ساتھ جُڑے ہوتے ہیں۔ دھات جیسی ٹھوس چیزوں کے ایٹم اِس طرح ایک دُوسرے کے ساتھ چمٹے ہوتے ہیں کہ جُدا نہیں ہو سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ ٹھوس اشیا بہت سخت اور مضبُوط ہوتی ہیں۔

اکثر چیزوں کے ایٹم گروپوں یا جھمگٹوں کی شکل میں ہوتے ہیں۔ ان جھمگٹوں کو سالمے (MOLECULES) کہا جاتا ہے۔ سالمے، ایٹموں کی طرح آپس میں مضبُوطی سے جُڑے نہیں ہوتے۔ سیال اشیا اور گیسوں کے سالمے تو ایک دُوسرے سے کافی الگ ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سیال چیزیں اور

گیس آسانی سے بہتی اور اڑتی ہیں۔

ایٹم کے اندر کیا ہوتا ہے؟ آپ کو یہ جان کر تعجب ہوگا کہ ایٹم بالکل کھوکھلے ہوتے ہیں۔ ہر ایٹم کے باہر ایک یا ایک سے زائد ننھے ننھے ذرّے ہوتے ہیں، جنھیں الیکٹرون کہا جاتا ہے۔ ہر الیکٹرون ایٹم سے ایک لاکھ گنا چھوٹا ہوتا ہے۔

ایٹم کے بیچوں بیچ ایک ننھا سا مرکزہ یا نیوکلیس (NUCLEUS) ہوتا ہے جو ان ننھے ننھے ذرّوں سے بنتا ہے، جنھیں پروٹون اور نیوٹرون کہتے ہیں۔ یہ ذرّے یعنی پروٹون اور نیوٹرون بھی اتنے ہی چھوٹے ہوتے ہیں جتنے الیکٹرون۔

مختلف قسم کے ایٹموں میں ان ذرّوں کی تعداد مختلف ہوتی ہے۔ پس آپ اپنے اردگرد جو چیزیں بھی دیکھتے ہیں، وہ بنیادی طور پر تین چیزوں سے مل کر بنی ہوتی ہیں یعنی الیکٹرون، پروٹون اور نیوٹرون۔

ایٹم کے یہ ذرّے بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔ لیکن ان میں بے پناہ طاقت ہوتی ہے۔ یہ نیوکلیائی طاقت کہلاتی ہے اور اسے نیوکلیائی بجلی گھروں میں ایٹمی ری ایکٹر کے ذریعے پیدا کیا جاتا ہے۔ یہ اُس طاقت سے مختلف ہوتی ہے جو کوئلے، گیس یا تیل کو جلا کر حاصل کی جاتی ہے۔ اس کا ایندھن ایک دھات ہے جسے یورینیم یا پلوٹینیم کہتے ہیں۔ اس دھات کی مناسب مقدار ری ایکٹر میں رکھ کر اسے گرم کیا جاتا ہے۔ گرمی سے دھات کے ایٹم ٹوٹنے لگتے ہیں اور اُن کے ذرّے ٹوٹ کر چھوٹے ایٹم بن جاتے ہیں۔ جب یہ ایٹم دُوسرے ایٹموں میں بدلتے ہیں تو اس سے بہت بڑی مقدار میں حرارت پیدا ہوتی ہے کیوں کہ یورینیم یا پلوٹینیم کوئلے، گیس اور تیل کے مقابلے میں ہزاروں گنا زیادہ حرارت پیدا کرتی ہے۔ ایٹمی بجلی گھروں میں اسی حرارت سے جنریٹر چلا کر بجلی پیدا کی جاتی ہے۔

ایٹم صرف ایٹمی ری ایکٹر ہی میں توڑے جا سکتے ہیں۔ کیوں کہ جب وہ ٹوٹتے ہیں تو اُن سے خاص قسم کی شعاعیں نکلتی ہیں جو جان داروں کے لیے نقصان دہ ہوتی ہیں اور اُن سے موت تک واقع ہو سکتی ہے۔ اسے تاب کاری (RADIATION) کہتے ہیں۔ اس لیے ایٹمی ری ایکٹروں کو کنکریٹ کے موٹے موٹے بلاکوں سے ڈھانپا جاتا ہے تاکہ یہ شعاعیں باہر نہ نکل سکیں۔ پچھلے تیس برسوں میں مختلف ملکوں میں ایٹمی ری ایکٹروں سے تاب کار شعاعیں خارج ہوتے کے کئی واقعات ہو چکے ہیں۔ لیکن شکر ہے کہ ان سے بہت زیادہ جانی نقصان نہیں ہُوا۔ 1957 میں انگلینڈ کے ونڈ سکیل ایٹمی بجلی گھر میں آگ لگ گئی تھی۔ 1979 میں ریاست ہائے متحدہ امریکا کے تھری مائل آئی لینڈ کے ایٹمی بجلی گھر میں ری ایکٹر کو ٹھنڈا کرنے والے نظام میں خرابی پیدا ہو گئی تھی، اور اس جزیرے کی بیس ہزار آبادی کو عجلت میں وہاں سے نکالنا پڑا تھا۔ 1986 میں سوویت یونین (روس) کے چرنوبائل ری ایکٹر میں خرابی ہو گئی تھی جس سے بجلی گھر میں آگ لگ گئی اور 31 آدمی تاب کاری سے ہلاک ہو گئے۔

ہمارا سُورج خلا میں ایک بُہت بڑے نیوکلیائی بجلی گھر کی طرح ہے۔ لیکن یہ مختلف طریقے سے کام کرتا ہے۔ اس کا ایندھن ہائیڈروجن گیس ہے جو لگاتار جلتی رہتی ہے۔ سُورج کا مرکز اتنا گرم ہے کہ یہاں نیوکلیائی ذرات آپس میں مل کر زیادہ بڑے ایٹم بن جاتے ہیں۔ جب ان ایٹموں کی شکل بدلتی ہے تو ان سے بے پناہ حرارت خارج ہوتی ہے اور سورج بھڑکتی ہوئی آگ کا گولا معلوم ہوتا ہے۔ اسی حرارت اور روشنی کا کچھ حصّہ، فضا کو چیر کر، زمین پر آتا ہے۔ اب سائنس دان اس کوشش میں ہیں کہ سُورج کی طرح کے بجلی گھر بنائے جائیں۔ ان بجلی گھروں میں خاص قسم کی ہائیڈروجن استعمال کی جائے گی، جو سمندروں میں پائی جاتی ہے۔ اگر سائنس دان اپنی کوشش میں کامیاب ہو گئے تو ہمیں طاقت یا توانائی کا ایک کبھی ختم نہ ہونے والا ذریعہ مل جائے گا۔

جب کسی سیّال کے سالمے گرم کیے جاتے ہیں تو وہ تیزی سے حرکت کرتے ہیں۔ ان میں سے کچھ سیّال کی سطح سے اُڑ کر اُوپر چلے جاتے ہیں۔ اسے عملِ تبخیر (بخارات بننے کا عمل) کہا جاتا ہے۔ جب یہ سالمے بُلبلے بنتے ہیں تو اسے اُبلنا کہتے ہیں۔ جب گیس کے سالمے کسی ٹھنڈی سطح کو چھوتے ہیں تو ٹھنڈے ہو کر کثیف ہو جاتے ہیں۔ آپ نے سردیوں میں اپنے غسل خانے میں گرم پانی کی بھاپ کو آئینے پر جمتے دیکھا ہوگا۔ اس کی وجہ یہی ہے (ص ل)

صُوفی غلام مصطفیٰ تبسّم

قائدِ اعظمؒ

تیری ہی ہمتوں سے ، آزاد ہم ہُوئے ہیں
خوشیاں ملی ہیں ہم کو ، دِل شاد ہم ہُوئے ہیں
تجُھ سے ہی لہلہایا ، یہ گلستاں ہمارا

ہم سو رہے تھے تُونے ، آ کر ہمیں جگایا
پھرتے تھے ہم بھٹکتے ، رستہ ہمیں بتایا
تُو رہ نُما ہمارا ، تُو ساربان ہمارا

تیرے ہی حوصلے سے ، طاقت ملی ہے ہم کو
تیری ہی آب رُو سے ، عزت ملی ہے ہم کو
چمکا ہے تیرے دم سے ، قومی نشاں ہمارا

اس دیس میں ابھی تک ، چرچا ہے عام تیرا
جس شخص کو بھی دیکھا ، لیتا ہے نام تیرا
دِل تیری یاد سے ہے ، اب تک جواں ہمارا

ہم جو قدم اُٹھائیں ، آتی ہے یاد تیری
ہم جس طرف بھی جائیں ، آتی ہے یاد تیری
تجُھ سے رواں دواں ہے ، یہ کارواں ہمارا

بچپن کے دن

محمد حسن اجمل صدیقی

بچپن کے بارے میں جب بھی سوچتا ہوں، ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ کھیل جاتی ہے۔ کیسے دن تھے وہ بھی! سکون کے دن، بے فکری کے دن، خوشیوں کے دن۔ کوئی فکر پاس نہ ہو تو دماغ نت نئی شرارتیں تراشتا ہے۔ اور پھر وہ بچپن ہی کیا جس میں شرارتیں نہ ہوں۔ میرا بچپن بھی انھی شرارتوں کے درمیان گزرا ہے۔ بس شرارت ضرور کرتا تھا لیکن ایسی نہیں جس سے کسی کا نقصان ہو یا کسی کا دل دکھے۔ بس بے ضرر سی شرارتیں ہوتی تھیں۔ اس وقت میں آپ کو بچپن کی ایک شرارت سناتا ہوں۔

سردی کا موسم تھا۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ امی جان چند دن کے لیے اپنی بہن کے ہاں گئی ہوئی تھیں، اس لیے ہم سب بہن بھائی ابا جان کے کمرے میں سوتے تھے۔ میں لحاف میں دبکا ناول پڑھ رہا تھا۔ کبھی کبھی ایک نظر ابا جان پر بھی ڈال لیتا تھا جو کوئی کتاب پڑھنے میں مصروف تھے۔ رات کے نو بج رہے تھے۔ جب مجھے پڑھتے ہوئے تقریباً ڈیڑھ گھنٹا گزر گیا تو ابا جان کو کچھ شک ہوا۔ انھیں حیرت تھی کہ میں سائنس جیسا خشک مضمون دل لگا کر کیسے پڑھ رہا ہوں!

جب دو گھنٹے گزر گئے تو وہ چپکے سے اپنی چارپائی سے اٹھے اور میری طرف بڑھے۔ میں نے ان کے اٹھتے ہی پیر سکوڑے اور ناول کو پیروں میں دبا کر سائنس کی کتاب پر نظریں جما دیں۔ انھوں نے جھک کر کتاب دیکھی تو میرا دل دھک سے رہ گیا، کیوں کہ کتاب الٹی تھی۔ میں نے جلدی سے اسے سیدھا کیا اور بڑی سنجیدگی سے صفحے پر نظریں گاڑ دیں۔

ابا جان میرے ہاتھ سے کتاب لیتے ہوئے بولے "ہوں! تو یہ پڑھائی ہو رہی ہے؟ ذرا بستر سے نکلنا۔"

میں نے جل تُو جلال تُو پڑھتے ہوئے ناول کو وہیں چھوڑا اور بستر سے نکل کر فرش پر کھڑا ہو گیا۔ انھوں نے رضائی کھینچ کر پائینتی پر ڈال دی اور لگے تلاشی لینے۔ سب سے پہلے تکیے کے نیچے دیکھا، پھر چادر، گدے اور دری کی باری آئی۔ ناول کہیں نہ ملا۔ وہ لحاف کے اندر دبا ہوا تھا۔

وہ چارپائی کے نیچے دیکھتے ہوئے بولے:

"سچ سچ بتاؤ، ناول کہاں ہے؟"

میں نے بڑی معصومیت سے کہا "کیسا ناول؟ میں تو کیمسٹری یاد کر رہا تھا۔"

ابا جان کو میری بات کا یقین نہ آیا تھا، مگر ناول برآمد نہ ہونے کی وجہ سے کچھ کہہ بھی نہ سکتے تھے۔ تھوڑی دیر سوچتے رہے، پھر بولے "ذرا بتانا تو، کیا یاد کر رہے تھے؟"

"جی، امونیا گیس کے بارے میں پڑھ رہا تھا۔" میں نے جواب دیا۔

انھوں نے گھور کر میری طرف دیکھا، پھر کتاب میری طرف بڑھاتے ہوئے بولے "کون سا باب ہے امونیا گیس کا؟ ذرا نکالنا۔"

میں نے کتاب ان کے ہاتھ سے لے لی اور جیسے ہی پہلا صفحہ کھولا، دل دھک سے رہ گیا۔ وہ کیمسٹری کی نہیں، فزکس کی کتاب تھی!

ابا جان مجھے خاموش دیکھ کر بولے "کیا بات ہے؟ کتاب کیوں بند کر دی؟"

میں نے ہکلاتے ہوئے کہا "وہ..... وہ..... دراصل..... نیوٹن....."

"ایسی تیسی نیوٹن کی" وہ غصّے سے بولے "یہ امونیا گیس میں نیوٹن کہاں سے گھس آیا؟"

ابّا جان کی اس بات پر سب بہن بھائی جو بہ ظاہر سو رہے تھے، کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ ابّا جان نے سر گھما کر انھیں ڈانٹ پلائی اور پھر مجھ سے بولے "گدھے کہیں کے۔ پڑھتا ہوا کرے تو ٹھیک طرح پڑھا کرو۔ نہیں تو کوئی ضرورت نہیں ہے نیند خراب کرنے کی۔" اور میں نے بڑی شرافت سے سر جھکا دیا۔

تھوڑی دیر بعد انھوں نے حکم دیا "چلو، لیٹو۔"

میں جو بھیگی بلی بنا کھڑا تھا، بستر پر لیٹ گیا۔ پھر بڑے اطمینان سے رضائی کھینچ کر سینے تک لایا۔ ڈر تھا کہیں رضائی کھینچنے سے ناول نیچے نہ گر جائے۔ اور میری یہی حرکت ابّا جان نے تاڑ لی۔ انھوں نے رضائی اٹھا کر دوسری چارپائی پر ڈال دی۔ میں نے آنکھیں یوں بند کر لیں جیسے بلی کو دیکھ کر کبوتر بند کر لیتا ہے۔ اب حالت یہ تھی کہ میں آنکھیں بند کیے چت لیٹا تھا اور ناول پیروں کے نیچے دبا ہوا تھا۔

تھوڑی دیر بعد یوں محسوس ہوا جیسے باہر بادل گرج رہے ہیں اور کمرے میں ابّا جان۔ اور پھر ایک دم مجھ پر اولے پڑنے لگے۔ پہلا تھپّڑ پڑنے پر میں یوں اچھلا جیسے بستر نے کاٹ کھایا ہو۔ لیکن اس اچھل کود کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ تھپّڑ پڑنے اس وقت بند ہوئے جب ابّا جان کا ہاتھ تھک گیا اور وہ غصّے سے بڑبڑاتے ہوئے اپنی چارپائی پر جا لیٹے۔

اب چھوٹے بھائی کو شرارت سوجھی تو لگا منھ چڑانے۔ رضائی سے منھ نکالتا، منھ چڑاتا اور پھر غڑاپ سے منھ اندر کر لیتا۔ میں دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ جاتا۔ بس چلتا تو دو چار ہاتھ اس کے ضرور جماتا، لیکن ابّا جان کے ہوتے ہوئے یہ ممکن نہ تھا۔ آخر مجھے بھی شرارت سوجھی۔ میں نے رضائی کے اندر منھ کر کے "کھی کھی کھی" کی آواز نکالی۔ سب بہن بھائی بے ساختہ ہنس پڑے۔ ابّا جان نے ڈانٹ کر کہا:

"یہ کیا آدھی رات کو دانت نکال رہے ہو۔ چپ چاپ سو جاؤ۔"

ایک بھائی ہنستے ہوئے بولا "ابّو، بھائی جان ہنسا رہے ہیں۔"

ابّا جان نے مجھ سے کہا "اگر پڑھنا نہیں ہے تو لائٹ آف کر دو۔"

اور یہ کہ کر خود ہی بتی بجھا دی۔

بارش ہو رہی تھی۔ ابّا جان کی چارپائی دروازے کے پاس تھی۔ دروازہ ہوا سے کھٹ کھٹ کر رہا تھا اور اس کی درزوں سے ٹھنڈی ہوا اندر آ رہی تھی۔ وہ جلدی سے اٹھے اور چارپائی کھینچ کر میری دائیں جانب آ گئے۔ اب بائیں طرف تو دو بھائیوں کی چارپائیاں تھیں اور دائیں جانب ابّا جان کی۔ ابّا جان کے ساتھ ہی میرا ایک چھوٹا بھائی لیٹا ہوا تھا۔

میرے دماغ میں پھر ایک شرارت نے جنم لیا۔ فرش پر ہاتھ پھیرا تو ایک تنکا ہاتھ آ گیا۔ میں نے ہاتھ بڑھایا اور ابّا جان کے ساتھ لیٹے ہوئے بھائی کے کان میں پھرا دیا۔ اس نے جلدی سے کان کھجایا اور زور سے ہنسا۔ ابّا جان نے کس کے ایک ہاتھ دیا اور بولے "پھر ہنسے۔ اب سونے بھی دوگے کہ نہیں؟"

وہ بولا "بھائی جان کان میں تنکا پھرا رہے ہیں۔"

"سو جاؤ، چپ کر کے۔ اب شرارت کرے تو بتانا۔" ابّا جان نے ڈانٹ کر کہا۔

میں نے بھائی کے کان میں تنکا پھرا کر سر رضائی کے اندر کر لیا تھا۔ تقریباً پانچ منٹ بعد پھر سر نکالا اور آہستہ سے، ہاتھ بڑھا کر بھائی کے کان میں تنکا پھرا دیا۔ لیکن وہ بھائی کا کان نہیں تھا، یہ اس وقت معلوم ہوا جب ابّا جان ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ انھوں نے اٹھ کر بتی جلائی تو میں نے دیکھا، ان کی ایک انگلی کان میں تھی۔ اب مجھے کیا معلوم تھا کہ انھوں نے بھائی سے جگہ بدل لی ہے۔

اب حالت یہ تھی کہ وہ ایک ہاتھ سے کان کھجاتے جاتے تھے اور دوسرے ہاتھ سے میرے اوپر تھپّڑ برسا رہے تھے۔ سب بہن بھائی بھاگ کر دوسرے کمرے میں جا گھسے اور ان کے قہقہوں نے سارا گھر سر پر اٹھا لیا اور آخر میں ابّا جان بھی ہنس پڑے۔ بولے "بہت شریر ہے۔ مجھے بھی نہیں چھوڑتا۔"

اب میں انھیں کیسے سمجھاتا کہ قصور میرا نہیں، قصور تو اس تنکے کا تھا جو غلط جگہ پہنچ گیا۔

ہونہار مصوّر

جنوری 1989 سے تعلیم و تربیت میں ایک نیا سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے۔ پہلے صفحے پر اداریہ پڑھیے۔

کاغذ نہ جلائیں

کاغذ ہر صورت میں کار آمد شے ہے۔ یہ گل سڑ کر بھی
دوبارہ بنایا جا سکتا ہے۔
لیکن جل جائے تو ضائع ہو جاتا ہے۔ اس لیے **کاغذ نہ جلائیں**
استعمال شدہ کاغذ، ردّی کاغذ جمع کرنے والوں کو دے دیں۔
اس سے کاغذ بنانے والے کارخانے دوبارہ نیا کاغذ بنا لیں گے۔
اس طرح مُلکی صنعت کی خدمت بھی ہو سکتی ہے

سپورٹس

لان ٹینس

سید توقیر حسین شاہ

ٹینس کا شمار بھی دُنیا کے قدیم کھیلوں میں ہوتا ہے۔ تاریخ دانوں کا خیال ہے کہ قدیم زمانے کے مصر، یُونان اور ایران میں یہ کھیل کھیلا جاتا تھا۔ وہیں سے یہ فرانس میں پہنچا اور پھر وہاں سے یورپ کے دُوسرے مُلکوں اٹلی، سویڈن، جرمنی، رُوس اور انگلستان میں مقبول ہُوا۔ انگلستان کی ملکہ الزبتھ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ٹینس کی بُہت دِل دادہ تھیں اور پابندی سے اس کے مقابلے دیکھا کرتی تھیں۔

موجودہ کھیلے جانے والے ٹینس کا اصل نام لان ٹینس ہے۔ اس کا مُوجِد میجر والٹر ونگ فیلڈ تھا۔ 1873 میں میجر والٹر نے اِس کھیل کی بُنیاد رکھی اور 1874 میں اِس کو باقاعدہ رجسٹرڈ کروایا۔ اِسی دَور میں ایک امریکی خاتون میری آؤٹ بِرج نے یہ کھیل دیکھا تو اُن کو بُہت پسند آیا۔ اُنھوں نے ٹینس کا کُچھ سامان خریدا تاکہ امریکا جا کر وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ اِس کھیل سے لُطف اندوز ہوں۔ اِس طرح ٹینس امریکا میں بھی مقبُول ہُوا۔ کرکٹ کے مشہور کلب ایم سی سی نے 1875 میں اِس کھیل کے قاعدے قانُون بنائے۔

یہ تو ہُوئی اِس کی مُختصر سی تاریخ۔ اب سُنیے اِس کے میدان کے بارے میں۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، ٹینس لان یعنی گھاس کے میدان میں کھیلا جاتا ہے۔ مگر چوُں کہ ہر جگہ گھاس کا میدان (جس کو ٹینس کورٹ کہا جاتا ہے) بنانا مشکل ہے، اِس لیے سخت چکنی مٹّی کے کورٹ کے عِلاوہ سمینٹ کے کورٹ بھی بنائے جاتے ہیں اور آج کل تو مصنُوعی ٹرف پر بھی کورٹ بنائے جاتے ہیں۔ مگر سب سے زیادہ ٹینس کورٹ سمینٹ کے ہوتے ہیں جنھیں ہارڈ کورٹ کہتے ہیں۔

ٹینس کورٹ کی لمبائی 78 فُٹ اور چوڑائی 27 فُٹ ہوتی ہے۔ یہ سنگل کھیل کے لیے ہے۔ ڈبلز یعنی دو دو کھلاڑی دونوں طرف ہوں تو لمبائی تو وہی رہتی ہے مگر چوڑائی 36 فٹ ہو جاتی ہے۔ کورٹ کے درمیان میں جال تانا جاتا ہے، جس کا نِچلا سرا زمین سے لگا ہوتا ہے اور یہ سائیڈوں پر لگے پولوں سے بندھا ہوتا ہے۔ جال کی اُونچائی کونوں سے ½3 فُٹ اور بیچ میں سے 3 فٹ ہوتی ہے۔ کورٹ کے دونوں طرف 21، 21 فُٹ کے دو مُتوازی خلانے ہوتے ہیں جن کو سروس باکس کہا جاتا ہے۔ کورٹ کے سائیڈ کی لکیروں کو جو سفید رنگ سے کِھنچی ہوتی ہیں، سائیڈ لائن اور جہاں سے سروس کی جاتی ہے، اُس کو بیس لائن کہتے ہیں۔

کھیل سے پہلے ٹاس ہوتا ہے۔ جو کھلاڑی ٹاس جیت جاتا ہے، اُس کی مرضی ہے کہ وہ خود سروس کرے یا مُخالف کو دے دے۔ سروس کرنے والا کھلاڑی بیس لائن سے اِس طرح سروس کرے گا کہ گیند اُس کے سامنے مخالف کورٹ کے اُلٹے ہاتھ کے کونے میں کھڑے کھلاڑی تک پہنچنے سے پہلے 21 فُٹ کے سروس باکس میں گِرے۔ اگر گیند باکس سے باہر گِرے گی یا جال میں لگے گی تو سروس فالٹ ہو جائے گی۔ اِس کے بعد ایک اور سروس ملے گی۔ اگر وہ بھی فالٹ ہو جائے تو مُخالف کو پوائنٹ مِل جاتا ہے۔ بعض

کرتے وقت کھلاڑی کا پاؤں لائن کے اندر چلا جائے، تب بھی سروس فالٹ ہو جائے گی، جس کو فٹ فالٹ کہتے ہیں۔ اگر سروس ٹھیک ہو تو مخالف گیند کو اس طرح ضرب لگائے گا کہ گیند جال کے اُوپر سے دوبارہ سروس کرنے والے کی طرف آئے۔ اِس طرح کھیل شرُوع ہو جائے گا۔ جس کھلاڑی سے گیند جال میں چلی جائے یا وہ گیند کو اپنی طرف گرنے کے بعد دُوسرے ٹپّے سے پہلے ضرب نہ لگا سکے تو اِس کے مخالف کو پوائنٹ ملے گا۔ اسی طرح کسی کھلاڑی کے ریکٹ سے گیند لگ کر باہر گرے یا اُس کی ضرب سے مخالف کے کورٹ کے باہر گرے، تب بھی پوائنٹ مخالف کو ملے گا۔ اگر کوئی کھلاڑی گیند کو ضرب لگاتے ہُوئے نیٹ سے ٹکرا جائے یا اُس کا ریکٹ نیٹ کے اُوپر آجائے، تب بھی مخالف کو پوائنٹ ملے گا۔ ٹینس کا پہلا پوائنٹ 15.0، دُوسرا 30.0 اور تیسرا 40.0 کہلاتا ہے۔ چوتھے پوائنٹ کے بعد کھیل ختم ہو جاتا ہے۔ اِس کو ایک گیم کہتے ہیں۔ اگر برابر ہو جائے تو اِس کو ڈیوس کہا جاتا ہے۔ ڈیوس کے بعد جو کھلاڑی پوائنٹ حاصل کرتا ہے، اُس کو ایڈوانٹیج کہتے ہیں۔ اگر سروس کرنے والے نے پوائنٹ حاصل کیا ہے تو اِسے ایڈوانٹیج اِن اور مخالف نے لیا ہے تو ایڈوانٹیج آؤٹ کہتے ہیں۔ ایڈوانٹیج کے بعد ایڈوانٹیج لینے والا ایک اور پوائنٹ لے لے تو کھیل ختم ہو جاتا ہے۔ اِس طرح پھر مخالِف سروس کرتا ہے۔ ایک سیٹ میں چھ گیم ہوتے ہیں۔ اگر 5، 5 گیم برابر ہو جائیں تو پہلے 7 گیم کرنے والا جیت جاتا ہے ورنہ 6، 6 برابر ہونے کی صُورت میں ٹائی بریکر ہوتا ہے۔ ٹائی بریکر میں دونوں باری باری سروس کرتے ہیں۔ جو کھلاڑی پہلے 7 پوائنٹ حاصل کرے، وہ سیٹ جیت جاتا ہے، لیکن 2 پوائنٹ کا فرق لازمی ہونا چاہیے یعنی 5، 7۔

بین الاقوامی میچوں میں مردوں کے ابتدائی میچ تین سیٹ پر اور کوارٹر فائنل، سیمی فائنل، فائنل وغیرہ 5 سیٹ پر مشتمل ہوتے ہیں۔ جو تین سیٹ جیت جائے وہ میچ جیت جاتا ہے۔ خواتین کے مقابلے تین سیٹ کے ہوتے ہیں۔

ٹینس کا ریکٹ 27 انچ لمبا ہوتا ہے اور لکڑی کے علاوہ سٹیل یا گریفائیٹ کی دھات سے بنایا جاتا ہے۔ گیند کا قُطر 8 انچ کے قریب یا اس سے کچھ زیادہ ہوتا ہے۔ کھلاڑی عمُوماً سفید نیکر اور ٹی شرٹ پہنتے ہیں۔ بڑے میچوں میں بڑے ریفری کے علاوہ جو جال کے پاس اُونچی کرسی پر بیٹھا ہوتا ہے، دونوں طرف تین تین لائن مین اور ایک نیٹ امپائر ہوتا ہے۔ اِن کی مدد سے ریفری فیصلہ کرتے ہیں۔

ٹینس مقابلے یُوں تو سارا سال ہوتے رہتے ہیں مگر ان میں مشہور چیمپئن شپ انگلینڈ کے ومبلڈن مقابلے ہیں جو 1877 میں مردوں کے لیے اور 1884 میں خواتین کے لیے شروع ہُوئے۔ اس کے علاوہ یُو ایس اوپن، آسٹریلین اوپن، فرنچ اوپن بھی بڑی چیمپئن شپ ہیں۔ جو کھلاڑی یہ چار مقابلے ایک سال میں جیت لیتا ہے وہ گرانڈ سلام مکمل کر لیتا ہے۔ ابھی 1988 میں جرمنی کی خاتون کھلاڑی اسٹیفی گراف نے یہ چار بڑے مقابلے جیت کر گرانڈ سلام مکمّل کیا ہے۔ ٹینس کو اب دوبارہ اولمپک میں شامل کر لیا گیا ہے۔ سیول میں اِس کے مقابلے ہو چکے ہیں۔

ٹینس میں کئی کھلاڑیوں نے نام پیدا کیا ہے۔ سویڈن کے مشہور کھلاڑی بیورگ نے ومبلڈن کا اعزاز لگاتار پانچ مرتبہ (1976 سے 1980 تک) جیتا۔ اِس کے علاوہ امریکی کھلاڑیوں میں آرتھر ایش، جمی کارنرز، جان مکنرو، امریکی خاتون کھلاڑیوں میں کرس ایورٹ، مارٹینا، بلی جین کنگ بہت مشہور کھلاڑی ہیں۔ کچھ برسوں سے جرمنی کے بورس بیکر، جنھوں نے کم عُمری میں 1985 کا ومبلڈن جیتا تھا، صفِ اوّل کے کھلاڑی ہیں۔ پیٹرک کیش (آسٹریلیا)، میٹس ویلنڈر (سویڈن) اور سٹیفن ایڈبرگ (سویڈن) کا نام بھی اچھے کھلاڑیوں میں شمار ہوتا ہے۔

ڈیوس کپ کے مقابلے بھی ٹینس کے اہم مقابلے ہیں۔ 1900 میں اِن مقابلوں کا آغاز ہُوا۔ امریکا کے ایک کھلاڑی ڈوائٹ فلی ڈیوس نے 1899 میں اس مقابلے کے لیے ٹرافی پیش کی تھی۔ اس لیے یہ کپ اس کے نام سے منسوب ہے۔ ڈیوس کپ کے مقابلے کے لیے دنیا کے تمام ممالک کو امریکا زون، یورپ زون اور ایسٹرن زون میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ 1948 میں پہلی مرتبہ پاکستان نے ڈیوس کپ میں شرکت کی۔ اس کے بعد تقریباً ہر سال پاکستان اس میں شرکت کرتا رہا ہے۔ 1984 میں پہلی مرتبہ پاکستان اس کے فائنل میں پہنچا۔ ومبلڈن کے مقابلوں میں دو پاکستانی ہارون رحیم اور سعید میر شرکت کر چکے ہیں۔ مگر وہ ابتدا میں ہی ہار گئے۔ آج کل اسلام الحق، رشید ملک، حمید الحق کے علاوہ مصحف ضیاء اور حبیب اسلم ٹینس کے بہترین کھلاڑی ہیں اور پاکستان کو ان سے بڑی اُمیدیں ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام

اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے۔ یعنی وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ اُس کے لیے کوئی کام مشکل نہیں۔ اُس نے حضرت آدم علیہ السلام کو ماں باپ کے بغیر پیدا کیا۔ اِسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام بغیر باپ کے دُنیا میں تشریف لائے۔ آپ کی والدہ کا نام مریم تھا جو بہت نیک اور عبادت گزار خاتون تھیں۔

ایک دن ایک فرشتہ، آدمی کی شکل میں، حضرت مریمؑ کے سامنے آ کھڑا ہوا جسے دیکھ کر وہ ڈر گئیں۔ فرشتے نے بڑی مُلائم آواز میں کہا:

"مریم! ڈرو نہیں۔ میں خدا کا فرشتہ ہوں اور اُس کی طرف سے تمھارے لیے یہ خوش خبری لے کر آیا ہوں کہ تم عن قریب ایک بیٹے کی ماں بنوگی جو پیغمبر ہوگا۔"

یہ سُن کر حضرت مریمؑ نے کہا "میں تو شادی شدہ نہیں ہوں میرے ہاں بیٹا کیوں کر پیدا ہو سکتا ہے؟"

فرشتے نے کہا "خدا ہر بات کی قدرت رکھتا ہے۔ وہ دُنیا کو یہ معجزہ دکھلائے گا۔"

جب حضرت عیسیٰؑ پیدا ہوئے تو آپ کے سر کے اُوپر ایک ایسا ستارہ چمک رہا تھا جسے نبی کے پیدا ہونے کی نشانی سمجھا جاتا ہے۔ اُس وقت حضرت مریمؑ جُودیا (جنوبی فلسطین) کے ایک مقام بیتُ اللحم میں رہتی تھیں۔ حضرت عیسیٰؑ تیس سال کے ہُوئے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنا رسول بنایا، آپ پر اپنی پاک کتاب انجیل نازل کی اور حکم دیا کہ لوگوں کو بھلائی کی طرف بُلاؤ اور بُرائی سے روکو۔

ایک روز حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک عبادت گاہ کے پاس سے گزر رہے تھے۔ آپ نے دیکھا کہ ایک غریب اور پریشان حال عورت عبادت گاہ کی سیڑھیوں پر دو زانو بیٹھی ہے اور لوگ اُسے پتھر مار رہے ہیں۔ آپ نے لوگوں سے کہا "رُک جاؤ! اس غریب عورت کو پتھر کیوں مارتے ہو؟"

لوگوں نے جواب دیا "یہ عورت گناہ گار ہے۔ اِس کی یہی سزا ہے کہ اسے پتھر مار مار کر ہلاک کر دیا جائے۔"

آپ نے فرمایا "یہ بات ہے تو اسے وہ شخص پتھر مارے جس نے زندگی میں کبھی کوئی گناہ نہ کیا ہو۔" یہ سُن کر لوگوں کے ہاتھ رُک گئے اور غریب عورت کی جان بچ گئی۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کو کئی معجزے عطا کیے تھے۔ آپ اندھوں کی آنکھیں دوبارہ روشن کر دیتے اور کوڑھیوں کے جسم پر ہاتھ پھیر کر اُنھیں تن درُست کر دیتے تھے۔ آپ شہر شہر، گاؤں گاؤں پھر کر دُکھی لوگوں کی مدد کرتے اور ساتھ ہی اُنھیں ایک اللہ کی عبادت کرنے اور گناہوں سے بچنے کی تلقین کرتے تھے۔ اُس زمانے میں فلسطین میں یہودیوں کی اکثریت تھی۔ مال دار یہُودی دولت کے نشے میں بدمست تھے اور عبادت گاہوں کے مُجاور بن کر سیدھے سادے لوگوں کو لُوٹتے تھے۔ اُنھوں نے اللہ کے دین میں ایسی باتیں شامل کر دی تھیں، جن کا مذہب سے دُور کا بھی تعلق نہ تھا۔ حضرت عیسیٰؑ نے اِن لوگوں کو سیدھے راستے پر آنے کو کہا تو وہ آپ کے دُشمن ہو گئے اور ایسے موقع کی تاک میں لگ گئے کہ کوئی اِلزام لگا کر آپ کو حکومت سے کڑی سزا دلوا سکیں۔

ایک دن حضرت عیسیٰؑ نے اِن یہُودیوں سے کہا "تم پر افسوس ہے کہ تم لوگوں پر خدا کی بادشاہت کے دروازے بند کرتے ہو۔ نہ آپ داخل ہوتے ہو، نہ دُوسروں کو داخل ہونے دیتے ہو۔" خدا کی بادشاہت سے حضرت عیسیٰؑ کی مُراد ایسی حکومت تھی جس کا ہر کام خدا کے دین کے مُطابق ہو۔ مگر یہُودیوں کو بہانہ مِل گیا۔ وہ فلسطین کے گورنر کے پاس گئے اور اُس سے کہا کہ عیسیٰؑ لوگوں کو آپ کی حکومت کے خِلاف بھڑکاتا ہے اور وہ یہاں خدا کی بادشاہت قائم کرنا چاہتا ہے۔"

اُن دِنوں فلسطین پر سلطنتِ روما (اٹلی) کا قبضہ تھا اور ایک رومی، پونتیس پائلیٹ، یہاں کا گورنر تھا۔ اُس نے حضرت عیسیٰؑ کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ حضرت عیسیٰؑ کو پیغمبری مِلے صِرف دو اڑھائی سال ہُوئے تھے اور ابھی صِرف بارہ آدمی ایمان لائے تھے۔ اِن میں سے بھی ایک غدّار نکلا اور اُس نے آپ کو گرفتار کرا دیا۔ رومی سپاہیوں نے آپ کے سر پر کانٹوں کا تاج رکھا اور صلیب (سُولی) پر لٹکا کر ہاتھ پیروں میں میخیں ٹھونک دیں۔ عیسائی کہتے ہیں کہ اِسی حالت میں آپ کا اِنتقال ہو گیا۔ لیکن قرآن شریف میں ہے کہ نہ آپ قتل کیے گئے اور نہ سُولی پر چڑھائے گئے۔ دُشمنوں نے آپ کے دھوکے میں کسی دُوسرے شخص کو سُولی پر چڑھا دیا اور آپ کو زندہ آسمان پر اُٹھا لیا گیا۔ عیسائی عالموں کے مُطابق حضرت عیسیٰؑ 25 دسمبر کو پیدا ہُوئے تھے۔ اس تاریخ کو تمام عیسائی دُنیا میں آپ کا یومِ پیدائش بہت دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ اِسے کرسمس کہتے ہیں۔

نومبر 1988 کے مقابلے میں
انعام پانے والی کہانیاں

سیلاب آگیا

فضل احمد خانی ۔ ربوہ

کھیتی باڑی کے کاموں سے فارغ ہو کر ہمارے گاؤں کے کسان گھر پہنچے تو کرموں چوکیدار گاؤں کی گلیوں میں آواز لگا رہا تھا "بھائیو! سیلاب آنے والا ہے۔ اپنا بندوبست کر لو!" یہ اعلان سن کر کچھ لوگ چاچا رحمت کے ڈیرے پر گئے اور کہا "چاچا، کچھ تم نے سنا، یہ کرموں چوکیدار کیا کہہ رہا ہے؟" چاچا رحمت بولا "یارو، وہ بے وقوف ہے۔ اُس کا دماغ خراب ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تمھیں کیسے پتا چلا کہ سیلاب آرہا ہے، تو کہنے لگا، تحصیل دار صاحب کا آدمی آیا تھا۔ وہ خبردار کر گیا ہے کہ گاؤں چھوڑ کر محفوظ مقامات پر چلے جاؤ۔ واہ بھئی واہ! اب تم ہی بتاؤ کہ بھلا اس موسم میں بھی کبھی سیلاب آیا ہے؟"

افضل جٹ دو چار جماعتیں پڑھا ہوا تھا اُس نے مشورہ دیا کہ ریڈیو لگا کر دیکھو۔ اس نے ریڈیو لگایا تو اُس میں پاکستانی فلمی گانے لگے ہوئے تھے۔ سب لوگ زور زور سے ہنسنے لگے۔

"اس بات کو چھوڑو۔ کچھ کھیتی باڑی کی بات کرو" رحموں بولا "چاچا، اس دفعہ دھان، کپاس اور گنّے کی فصل بہت اچھی ہوئی ہے۔ ہمارے تو وارے نیارے ہو جائیں گے۔"

اتنے میں ماما فضلو آگیا۔ وہ لاہور گیا ہوا تھا۔ سب لوگ اُس سے پوچھنے لگے کہ سیلاب کی خبر سچ ہے۔ ماما فضلو کہنے لگا کہ شہر میں لوگ باتیں کرتے میں نے دیکھے تو ہیں، کہہ رہے تھے کہ پانی ہندوستان سے آرہا ہے۔ ہمیں فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہمارا گاؤں دریائے چناب سے پانچ میل دور ہے اور پھر اونچی جگہ پر آباد ہے۔ میرا باپ نور محمد بتایا کرتا تھا کہ ایک دفعہ یہاں سیلاب کا پانی ضرور آیا تھا لیکن کوئی خاص نقصان نہیں ہوا تھا۔ اور آج تو میں نے راوی خود دیکھا ہے۔ اُس میں تو پانی بس ٹھیک ٹھاک ہی ہے۔ یہ خبر معلوم ہوتا ہے کسی دشمن نے اُڑائی ہے۔

وہ دن تو خیر سے گزر گیا، لیکن دوسرے دن ہمارے ساتھ کے سارے گاؤں دیکھتے ہی دیکھتے پانی میں ڈوب گئے۔ سیلاب آیا اور ایسا آیا کہ کسی کو خبر ہی نہ ہو سکی۔ اور پھر جب پانی نے ہمارے گاؤں کا رخ کیا تو چاچا رحمت کہنے لگا "گھبراؤ مت، ایسا پانی ہم نے پہلے بھی کئی بار دیکھا ہے۔"

لیکن رات ہوتے ہوتے سیلاب کا پانی گاؤں کی گلیوں میں داخل ہوگیا۔ ہر طرف افراتفری کا عالم تھا۔ ہم نے مویشیوں کو، جو باہر درختوں کے نیچے بندھے ہوئے تھے، کھلا چھوڑ دیا اور خود کوٹھوں کی چھتوں پر چڑھ گئے۔ آدھے سے زیادہ گاؤں ڈوب چکا تو ہر طرف بچاؤ بچاؤ کی آوازیں آنے لگیں۔ گائے بھینسیں، بھیڑ بکریاں، اناج، گھروں کا سامان سب کچھ ہماری آنکھوں کے سامنے پانی میں بہ گیا۔ کچھ لوگ تو مسجد کی چھت پر چڑھ گئے اور کچھ نے تحصیل دار صاحب کے پکّے مکان کی چھت پر ڈیرا جما لیا۔ کئی لوگ درختوں پر چڑھ گئے۔

خدا کی پناہ! آٹھ آٹھ فٹ پانی! یا اللہ! توبہ! یہ سیلاب ہے یا طوفانِ نوح! اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک کشتی ہمارے گاؤں کی طرف آرہی ہے۔ نزدیک آئی تو اُس میں چند فوجی جوان نظر آئے۔ انھوں نے پانی میں گھرے ہوئے لوگوں کو محفوظ مقامات تک پہنچانا شروع کر دیا۔ مویشی تو پانی کی نذر ہو گئے تھے۔ ہمیں اپنی جانوں کی فکر تھی۔ سب نے سکھ کا سانس لیا۔ اور جب آخری پھیرا رہ گیا تو کشتی میں بہت سارے لوگ بیٹھ گئے اور کشتی روانہ ہوگئی لیکن اچانک پانی کا ایک تیز ریلا آیا۔ کشتی ڈولنے لگی۔ سب سانس بند کر کے دعائیں کرنے لگے کہ یا اللہ خیر! لیکن کشتی اُلٹ گئی۔ چاچا رحمت سمیت کئی عورتیں، جوان، بچے اور بوڑھے پانی میں بہ گئے۔ ایک فوجی جوان بھی لوگوں کی جانیں بچاتے بچاتے خود لہروں میں گم ہوگیا اور اس طرح اُس نے اپنی جان کا نذرانہ دے کر یہ ثابت کر دیا کہ پاک فوج کے جیالے نہ صرف جنگ میں بلکہ ہر مشکل میں اپنے ہم وطنوں کی رکھوالی کرتے ہیں۔ "پاک فوج زندہ باد!" ہم نے نعرہ لگایا۔ اتنے میں ایک ہیلی کاپٹر اُڑتا ہوا آیا اور اُس نے خوراک کے پیکٹ گرائے۔ کھانا کھا کر ہماری جان میں جان آئی۔ لیکن دینو موچی کو سانپ نے کاٹ لیا۔ بابا رحموں کا بیٹا ہیضے سے فوت ہوگیا۔ ہم پھر سہم گئے۔ ڈر گئے۔

دوسرے روز ایک موٹر بوٹ میں چند ڈاکٹر آئے۔ انھوں نے ہمیں ٹیکے لگائے، دوائیاں دیں اور چلے گئے۔ پورے پانچ روز ہم نے اُس اونچے ٹیلے پر گزارے۔ تب پانی اُترنا شروع ہوا۔ آدھے سے زیادہ گاؤں سیلاب کی نذر ہوگیا تھا۔ ہم برباد ہوگئے تھے۔ ہمارا سب کچھ تباہ ہوگیا تھا۔ لیکن ہم مایوس نہ تھے۔ سارا ملک ہمارے ساتھ تھا۔ ہمارے ہم وطنوں نے دل کھول کر ہماری مدد کی اور چند ہفتوں میں ہم نے اپنی دنیا دوبارہ آباد کر لی۔ (پہلا انعام: 100/- روپے کی کتابیں)

(2)

صائمہ خاتون سندھو ۔ شاہدرہ ٹاؤن

"چپ ہو جا مُنّے، خدا کے لیے چپ ہو جا" رابعہ اپنے بھوک کے پیاسے بچّے کو گود میں اُٹھائے دھیرے دھیرے کہہ رہی تھی۔ بچّے کا خالی فیڈر سامنے زمین پر پڑا اُس کا مُنھ چڑا رہا تھا۔ وہ ایک اُونچے ٹیلے پر بیٹھی تھی، تین روز ہو گئے تھے، نہ پانی اُترا تھا اور نہ مُنّے کے ابّو کا کچھ پتا چلا تھا۔ اِس بار سیلاب اِس قدر اچانک آیا تھا کہ وہ کچھ بھی نہ سنبھال سکے تھے۔ اُس کا شوہر گاؤں سے چھ میل دُور ایک سٹیل مِل میں مُلازم تھا۔ وہ روزانہ صبح سویرے سائیکل پر نوکری پر جاتا اور اوور ٹائم لگانے کے بعد رات گئے واپس آتا۔ اُن کا پانچ افراد کا چھوٹا سا کنبہ تھا جس میں رابعہ، اُس کا شوہر، چھ سالہ نایاب، تین سال کا عُمیر اور آٹھ ماہ کا عدیل جسے وہ پیار سے مُنّا کہتے تھے، شامل تھے۔

ستمبر کی صبح رابعہ نے حسبِ معمول اپنے میاں کو ناشتا دیا اور پھر دوپہر کا کھانا دے کر اُسے ہنسی خوشی گھر سے روانہ کیا تھا۔ اُس کے خواب وخیال میں بھی نہ تھا کہ آج کا دن کتنا قیامت خیز ہوگا۔ دوپہر کے وقت اچانک شور مچا "بھاگو! بھاگو! دریا کا بند ٹوٹ رہا ہے!" وہ سمجھ نہ سکی کہ بند کیسے ٹوٹے گا دریا تو خشک پڑا ہے اور برسات کے دن تو مہینا ہُوا گزر چکے ہیں۔ اُس نے اِس شور پر دھیان نہ دیا اور میلے کپڑوں کو اکٹھا کر کے دھونے بیٹھ گئی۔ مگر باہر شور بڑھتا ہی گیا۔ لوگ چیخ رہے تھے "بھاگو! بھاگو! پانی آ رہا ہے۔" اُس نے باہر جھانک کر دیکھا تو پُورا گاؤں اپنا سامان اُٹھائے قریبی ٹیلے کی طرف دوڑ رہا تھا۔ اب اُس کا ماتھا ٹھنکا۔ مگر وہ کرے تو کیا کرے؟ یہ بھی اچھا ہُوا کہ آج نایاب سکول نہیں گئی تھی۔ لیکن وہ اکیلی جان، کیا اُٹھائے اور کیا چھوڑے۔ اِسی شش و پنج میں تھی کہ پانی کی شاں شاں اُس کے کانوں میں گونجنے لگی۔ اُس نے گھبرا کر مُنّے کو گود میں اُٹھایا، نایاب اور عُمیر کے ہاتھ پکڑے اور لوگوں کے پیچھے ٹیلے کی طرف بھاگ پڑی۔

سہ پہر ہوتے ہوتے پانی چاروں طرف پھیل گیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُن کے مکان پانی کے تُند و تیز ریلوں کی نذر ہو گئے تھے۔ رابعہ کا گھر پُورے چوبیس گھنٹے راوی کے طُوفان کا مُقابلہ کرتا رہا لیکن آخر کب تک۔ اگلے روز وہ بھی دھڑام سے پانی میں گر گیا۔ رات بھر کی بھوکی پیاسی اور تھکی ماندی رابعہ نے اپنے سامنے گھر کی ایک ایک چیز کو پانی میں بہتے ہُوئے دیکھا۔ مگر وہ کچھ بھی نہ کر سکی۔ پانی میں گھرے انھیں آج تیسرا روز تھا۔ صبح ہی صبح اُن کا ایک ہمسایہ اِس خاندان کے لیے ایک اور بُری خبر لایا تھا۔ اُس نے بتایا تھا کہ راوی کی ظالم لہروں کا مُقابلہ کرتے ہُوئے اُس کا میاں نہ جانے کدھر چلا گیا۔ اُس کی سائیکل ایک درخت کے ساتھ اٹکی ہُوئی ملی ہے۔

یہ خبر سُنتے ہی رابعہ پر غم کے پہاڑ ٹُوٹ پڑے وہ بچّوں کو سینے سے لگائے مُسلسل روئے جا رہی تھی۔ ایسے میں کوئی دلاسا دینے والا بھی نہ تھا۔ کیونکہ ہر گھر اِس آفت میں پھنسا ہوا تھا اور کئی خاندانوں کے چشم وچراغ لاپتہ تھے۔

آج صبح سے کسی کو نہ تو کھانے ہی کو کچھ مِلا تھا اور نہ پینے کو۔ بھوک کے پیاسے لوگ نیلے آسمان کو تک رہے تھے کہ خدایا! ہم سے کون سی غلطی ہو گئی ہے؟ اے مولا! ہمارے گناہ معاف فرما اور پانی کی صورت میں ہم پر بھیجا جانے والا یہ قہر ختم کر۔ آخر چوتھے روز حکومت کی ایک امدادی کشتی کھانے پینے کا سامان لے کر وہاں پہنچ گئی۔ لوگ اُس کی طرف دوڑ پڑے۔ ہر کوئی کھانے کے پیکٹ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن رابعہ نے بھیگی آنکھوں سے ایک اور ہی نظارہ دیکھا۔ اُس کو اپنے میاں کا ہنستا مُسکراتا چہرہ اُس کشتی میں نظر آ گیا تھا۔ وہ فوراً سجدے میں گر گئی "اے میرے مولیٰ! میرا گھر تو لُٹ گیا لیکن میرا سُہاگ بچ گیا۔ مَیں تیری شکر گزار ہُوں!" بچّے بے تابی سے اپنے باپ کی طرف لپکے، اور اِس خاندان کو گزشتہ چار روز میں جتنی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا تھا، آنِ واحد میں وہ سب ختم ہو گئیں۔ (دُوسرا انعام: 55/ روپے کی کتابیں)

(3)

عباد علی سحر ناز ۔ لاہور

"وُہ، وُہ ...." نوید نے مجھے اشارہ کیا۔

"ہاں، آج تو مزا آجائے گا۔ آؤ، ذرا اِسے تنگ کیا جائے۔" یہ کہہ کر مَیں نے اشفاق، ناصر اور احمد کو آواز دی، جو درخت پر چڑھے ہُوئے تھے۔ وہ تیزی سے نیچے آئے اور جُوں ہی وہ بُوڑھا ہمارے نزدیک آیا، ہم نے شور مچانا شروع کر دیا:

"سیلاب آگیا! سیلاب آگیا! سیلاب آگیا....!" یہ سُن کر وہ چیخنے لگا "سیلاب آگیا، سیلاب آگیا!" اور ایک طرف کو بھاگ گیا۔ ہم سب ہنسنے لگے۔

نام تو اُس کا خدا جانے کیا تھا، لیکن اُس کا چہرہ شناسا سا تھا۔ کیونکہ جب سے مَیں نے ہوش سنبھالا تھا، اُس کو گلیوں میں گھومتے پھرتے دیکھا تھا۔ وہ گلیوں میں سے گزرتا تو چھوٹے بڑے "سیلاب آگیا، سیلاب آگیا!" پکار اُٹھتے

تھے اور وہ بچاؤ، بچاؤ، سیلاب آگیا کی رٹ لگاتا ہُوا بھاگ جاتا تھا۔ لوگ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے۔

ایک دِن موسم خوش گوار تھا۔ ہم پانچوں یعنی ناصر، اشفاق، احمد، نوید اور میں دریا کے کنارے سیر کر رہے تھے کہ اچانک ہماری نظر اُس بُوڑھے پر پڑی۔ وہ ہماری طرف آرہا تھا میں نے اُسے دیکھ کر نوید سے کہا: "لو بھئی! خدا نے ہماری تفریح کا سامان کر دیا۔" اور جب وہ قریب آیا تو ہم نے، "سیلاب آگیا! سیلاب آگیا! سیلاب آگیا" کا شور مچا دیا۔

وہ کُچھ دیر کے لیے پریشان ہوگیا لیکن پھر اُس کے جُھرّیوں بھرے چہرے پر ایک خفیف سی مُسکراہٹ پھیل گئی۔ آج اُس کی حالت کُچھ اچھی معلوم ہوتی تھی۔ ورنہ اُس کے چہرے پر ہر وقت ہوائیاں اُڑتی رہتی تھیں۔ وہ ہمارے قریب آیا اور میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہُوئے بولا "بیٹا، کہانی سُنو گے؟"

ہم نے حیرانی سے ایک دُوسرے کی طرف دیکھا اور نہ چاہتے ہُوئے بھی ہاں کر دی۔ "اچھا، آؤ۔ دریا کے کنارے بیٹھتے ہیں" یہ کہ کر وہ دریا کے کنارے بیٹھ گیا اور ہم بھی اُس کے سامنے سبز گھاس کی چادر پر بیٹھ گئے۔

اُس نے ہماری طرف دیکھا اور پھر کہنے لگا:

"دریائے راوی کے کنارے فیروز پور نام کا ایک گاؤں تھا وہاں فضل دین نامی ایک کسان رہتا تھا۔ اللہ کا دیا، اُس کے پاس، سب کُچھ تھا تین چار گائے بھینسیں تھیں۔ کئی ایکڑ زمین تھی۔ اُس کے چار بیٹے تھے۔ چاروں کی شادیاں ہو چکی تھیں اور اُن کے بھی بیٹے بیٹیاں تھیں۔ فضل دین اپنے بھرے پُرے کُنبے کو دیکھ کر خوشی سے پُھولا نہ سماتا تھا۔

پھر ایک دن دریائے راوی میں طُغیانی آگئی۔ پانی آدھی رات کے وقت آیا جس کا اعلان ریڈیو اور گاؤں کی مساجد کے ذریعے کیا گیا۔ مگر سب لوگ اِس خیال میں تھے کہ یہ پانی ہمارا کیا بگاڑ سکتا ہے کیونکہ چھوٹے چھوٹے سیلاب اکثر آیا کرتے تھے۔ لیکن انھیں یہ خبر نہ تھی کہ یہ سیلاب اُن پر قیامت بن کر ٹُوٹے گا۔

وہ ایک منحوس رات تھی سارا گاؤں خوابِ خرگوش کے مزے لے رہا تھا کہ اچانک اُنھیں اپنی چارپائیوں کے نیچے پانی محسوس ہُوا۔ وہ تیزی سے اُٹھے۔ لیکن ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔ سیلاب کے بڑے بڑے ریلے آ رہے تھے اور اُن کے تیز بہاؤ کے سامنے کسی کا بس نہ چل رہا تھا۔ سارا گاؤں پانی کی لپیٹ میں آچکا تھا اور ایسے معلوم ہوتا تھا کہ پانی کا اژدھا سب کو چٹ کر کے چین لے گا۔ خدا کی قُدرت دیکھیے کہ فضل دین لکڑی کے ایک تختے پر بیٹھ گیا جو اُسے بہا کر بہُت دُور لے گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اُس گاؤں میں صرف اُسی کی جان بچی تھی، باقی سب سیلاب میں غرق ہو گئے تھے اور اُس کا خاندان بھی اُن میں شامل تھا۔ اِس واقعے کا فضل دین پر اتنا اثر ہُوا کہ وہ پاگل ہو گیا وہ جب پانی کا نام سنتا تو "بچاؤ، بچاؤ، سیلاب آگیا، سیلاب آگیا" پُکار اُٹھتا تھا۔

یہ کہ کر بُوڑھا خاموش ہو گیا۔ ہم نے اُس کی طرف دیکھا تو اُس کی آنکھوں میں پانی کا ریلا اُمڈ آیا تھا۔ اُس کی آنکھیں پُکار پُکار کر کہ رہی تھیں کہ فضل دین میں ہی ہُوں۔ میں ہی وہ بدبخت کسان ہوں۔ (تیسرا انعام: 40/ روپے کی کتابیں)

(4)

محمد مُبشّر عباس۔ مُلتان

شہر شہر، گاؤں گاؤں بارش کی دُعائیں مانگی جا رہی تھیں۔ دسمبر کا مہینا تھا جو بارشوں کی وجہ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ مگر اِس دفعہ حالت ہی مُختلف تھی بارش تو کیا ہوتی، بادل کے ایک ٹکڑے کا بھی نام و نشان نہ تھا۔ پُورے مُلک کو خشک سالی کا سامنا تھا۔ فصلوں کو سخت نُقصان پہنچا تھا اور اِسی وجہ سے بازار میں دالیں اور سبزیاں مہنگے داموں بِک رہی تھیں۔

مُلک کی تقریباً تمام مساجد کھچا کھچ بھری ہُوئی تھیں۔ لوگ اللہ کے حضور گڑگڑا کر مینھ برسنے کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ اکثر لوگ ایسے تھے جو اپنے گُناہوں اور خطاؤں کو یاد کر رہے تھے اور اپنے آپ کو بہُت بڑا مُجرِم سمجھ رہے تھے۔ اِن میں سے بعض ایسے بھی تھے جنھوں نے کبھی پابندی سے نماز ادا نہیں کی تھی۔ رمضان کے روزے نہیں رکھے تھے۔ کبھی غریبوں کی مدد نہیں کی تھی اور صرف اپنی ذات کی بھلائی کے کام کیے تھے۔ اب حالات نے اُن کو مجبُور کر دیا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے آگے ہاتھ پھیلائیں اور اپنی خطاؤں کی معافی مانگیں۔

دِن یُوں ہی گُزرتے رہے مگر بارش نہ ہُوئی۔ اب نئے سال کا سُورج طلُوع ہو چُکا تھا۔ لوگ بدستُور عبادت میں مشغول تھے۔ مردوں کے ساتھ ساتھ عورتیں بھی اپنے گھروں میں اللہ کی یاد میں مشغُول تھیں اور یُوں معلوم ہوتا تھا کہ شاید یہ مُلک دُنیا کا واحد اسلامی مُلک ہے جس کے تمام باشندے نیک اور عبادت گُزار ہیں۔

اچانک ایک رات آسمان کو بادلوں نے ڈھانپ لیا۔ گرج چمک نے لوگوں میں خوشی کی لہر دوڑا دی۔ پھر کُچھ ہی دیر بعد زور کی بارش ہُوئی۔ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی دعائیں سُن لی تھیں۔ اُن پر رحم کھا لیا تھا۔ اِس کے بعد بارشوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مُلک میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ غریب لوگوں کو سُکھ چین نصیب ہُوا۔ لوگوں کی کثیر تعداد جو روزانہ بارش کی دُعا کرنے

کے لیے مسجدوں میں باقاعدگی سے جاتی تھی۔ اپنے اپنے کاموں میں پہلے کی طرح مشغول ہوگئی اور مسجدوں میں پہلے کی طرح پھر ویرانی چھاگئی۔

مگر اللہ تعالیٰ کو مسلمانوں کی یہ بات پسند نہ آئی۔ چند ماہ بعد بارشیں اتنی شدید ہوئیں کہ سارے ملک میں سیلاب آگیا جس سے بڑی تباہی مچی لوگوں کا بُرا حال ہوگیا۔ اُنھوں نے پھر مسجدوں کا رُخ کیا اور رو رو کر اپنے گناہوں کی معافی مانگنے لگے۔ (چوتھا انعام: 30/. روپے کی کتابیں)

(5)

راشد بن یعقوب۔ گُلشنِ اقبال کراچی

دریائے سندھ کے کنارے ایک گاؤں میں ایک چودھری رہتا تھا اُس کا نام شجاعت علی تھا۔ اُس کے دو لڑکے اور ایک لڑکی تھی۔ بڑے لڑکے کا نام فراست علی، چھوٹے کا نام حشمت علی اور لڑکی کا نام نرگس تھا۔ فراست علی آٹھویں جماعت میں حشمت علی ساتویں میں اور نرگس تیسری میں پڑھتی تھی چودھری کے ان بچّوں نے ایک کتّا پال رکھا تھا جس سے تینوں بھائی بہن بہت پیار کرتے تھے۔ لیکن چودھری کو اُن کا یہ پیار ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ وہ بچّوں کو ڈانٹتا رہتا کہ کتّے کے ساتھ نہ کھیلا کرو۔ یہ ناپاک اور نجس ہے۔ اِسے دُور کہیں جنگل میں چھوڑ آؤ۔

اِس گاؤں سے ذرا دُور دریائے سندھ بہتا تھا۔ ایک دن اچانک دریا میں سیلاب آگیا اور پانی کی طوفانی لہروں نے گاؤں کی طرف بڑھنا شروع کردیا۔ رات کو چودھرانی کو پیاس لگی۔ وہ چارپائی سے نیچے اُتری تو گھٹنوں تک پانی میں ڈوب گئی۔ وہ گھبرا کر چیخنے لگی "سیلاب آگیا: سیلاب آگیا!" اُس کی چیخ پکار سے تمام گھر والے جاگ اُٹھے اور جس کے ہاتھ میں جو کچھ آیا، وہ اُٹھا کر ریلوے پُل کی جانب دوڑ پڑا۔ اب گاؤں کے دُوسرے لوگ بھی جاگ گئے تھے اور افراتفری اور پریشانی کے عالم میں اپنے برتن، بستر اور بچّوں کو اُٹھا کر گھٹنے گھٹنے پانی میں چلتے ہُوئے ریلوے پُل کی جانب بڑھ رہے تھے۔ سیلاب کا پانی تیزی سے کچے مکانوں کو ڈھاتا چلا جارہا تھا۔

ریلوے پُل پر پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد اچانک چودھری کو یاد آیا کہ اُس کا چھوٹا لڑکا حشمت علی جو اپنے کمرے میں سو رہا تھا، اُن کے ساتھ نہیں ہے۔ اُس نے چودھرانی کو بتایا تو وہ زور زور سے رونے لگی۔ چند ایک نوجوانوں نے یہ ماجرا سُنا تو اُنھوں نے ہمّت کرکے پانی میں چھلانگ لگادی، مگر ابھی تھوڑی دُور ہی گئے ہوں گے کہ اُنھیں سیلاب کے تیز ریلے نے واپس آنے پر مجبور کردیا۔ جب وہ نوجوان واپس آئے تو چودھرانی اور زور زور سے رونے لگی کہ اب اُس کے بچّے کو کون بچائے گا۔ کیا خبر مکان کی چھت ڈھے گئی ہو اور وہ اُس کے نیچے دب کر مرگیا ہو۔ ابھی وہ رونے دھونے میں ہی لگے ہُوئے تھے کہ کچھ لوگوں نے دیکھا کہ ایک کُتّا پانی میں تیرتا ہُوا اُن کی طرف آرہا ہے۔ وہ ایک بے ہوش لڑکے کو کھینچتا ہُوا لا رہا تھا۔ قریب آنے پر پتا چلا کہ وہ چودھری شجاعت کا لڑکا حشمت علی ہے۔ اُس کو دیکھ کر چودھری کے بڑے لڑکے نے پانی میں چھلانگ لگائی اور اپنے بھائی کو کاندھوں پر اُٹھا کر پُل پر پہنچ گیا۔ تھوڑی دیر بعد حشمت علی کو ہوش آگیا۔ سیلاب کے کچھ عرصے بعد گاؤں والوں نے اپنی محنت و مشقت سے اپنے مکان دوبارہ تعمیر کرلیے۔ اب چودھری اُس کتّے کو بہت پیار کرتا تھا۔ کیوں کہ اس نے اُس کے بیٹے کی جان بچائی تھی۔ (پانچواں انعام: 25 روپے کی کتابیں)

اب اُن پچاس بچّوں کے نام جن کی کہانیوں پر 15/15 روپے کی کتابیں انعام میں دی جارہی ہیں۔

نادیہ مصطفیٰ، جناح کالونی فیصل آباد۔ شہلا ناہید، رتہ امرال راولپنڈی۔ کوکب ارم، بھکر۔ سیدہ صدف عرفان، اسلام آباد۔ شازیہ نذر، سمن آباد لاہور۔ محمد صہیب اختر، لاہور کینٹ۔ جاوید احمد، لیاقت آباد کراچی۔ نگینہ جمال آفریدی، رام باغ مردان۔ محمد ادریس قُریشی، منڈی بہاءُ الدّین۔ رانا اِمتیاز احمد، غازی آباد لاہور۔ مختار علی، چیمبرلین لاہور۔ شازیہ سحر، لانڈھی کراچی۔ وقار احمد، یونیورسٹی ٹاؤن پشاور۔ محمّد عُمر افشین، سمن آباد لاہور۔ سجّاد بشیر رانا، جھنگ شہر۔ مسرور احمد، اسلام آباد۔ عُمر عنایت، لاہور کینٹ۔ فیصل مختار، سیٹلائٹ ٹاؤن بہاول پُور۔ ذوالفقار احمد ذوقی، ہری پور ہزارہ ضلع ایبٹ آباد۔ محمد عُمر، اسلام آباد۔ مصباح سعید، بھنڈاری چوک ساہیوال۔ عطاءُ المحسن طاہر، پنڈ دادن خان ضلع جہلم۔ فریدہ شوکت، کرشن نگر لاہور۔ عالیہ مہ جبین، نوشہرہ روڈ گوجرانوالہ۔ رانا محمد امجد، ستیانہ روڈ فیصل آباد۔ مُحمّد نوید رحمانی، سلطان پُورہ لاہور۔ محمد سُہیل اختر، اسلام آباد۔ نازیہ جبین، اسلام آباد۔ محمد شاکر، جمشید روڈ کراچی۔ محمد عمران، پتوکی ضلع قصُور۔ کامران حمید، وحدت کالونی لاہور۔ رفیع احمد خان، ملت روڈ فیصل آباد۔ اعجاز اختر، کبیر والا ضلع خانیوال۔ مُحمد عاقل احمد، پُرانا سکھر۔ محمد حامد زمان، اسلام آباد۔ محمودہ سلطانہ، دارالعلوم غربی ربوہ۔ محمد ندیم بٹ، کھاریاں کینٹ۔ سیدہ شاہ بانو، گُلشنِ اقبال کراچی۔ روبینہ جوہر، محلہ تیلیاں پشاور۔ نذیر احمد، ملیر کراچی۔ ثوبیہ ہاشمی، پیپلز کالونی فیصل آباد۔ افتخار بھٹی، لاہور کینٹ۔ شازیہ اختر، کُندیاں ضلع میانوالی۔ علی اصغر پڈّا، اکرم کالونی گوجرانوالہ۔ محمد رضوان، اورنگی ٹاؤن کراچی۔ مظفّر اقبال، حاجی والا ضلع گجرات۔ نسیم فردوس، فرید ٹاؤن ساہیوال۔ صائمہ اسلم، مسلم آباد ساہیوال۔ شمائلہ شیخ، ہربنس پُورہ لاہور۔ فیروزہ، سانده کلاں لاہور۔

محمد مقصود عالم 15 سال
کرکٹ کھیلنا، پرندے پالنا
مکان نمبر 856۔ ملک محلہ،
کوٹری۔

محمد طارق 14 سال
سائیکل چلانا
معرفت چیمہ جنرل سٹور، امرسدھو
لاہور۔

محمد نسیم 14 سال
اکیلا بیٹھنا
حسن آباد، بھاند ماڑی
پشاور شہر۔

افتخار احمد غوری 11 سال
کرکٹ کھیلنا
معرفت عظیم دواخانہ نواں شہر
شورکوٹ۔

انور علی 15 سال
تیراکی
فقیر علی دکاندار مسجد روڈ پاراچنار
(کرم ایجنسی)

سجاد احمد 14 سال
کرکٹ۔ فٹ بال
مکان نمبر 1071۔ بلاک نمبر 7
چیچہ وطنی۔

صفدر بشیر 14 سال
کرکٹ کھیلنا
مکان نمبر 233۔ E، گلی نمبر 12
مدینہ کالونی والٹن لاہور۔

وسیم عباس 15 سال
قلمی دوستی، ٹکٹیں جمع کرنا
معرفت عبدالرؤف سٹیم پاور سٹیشن
واپڈا کالونی نشاط آباد، فیصل آباد

سید رسول بخش شاہ 15 سال
مُطالعہ
معرفت سائیں دکاندار، رانگی واڑہ
ریلی گودام، کراچی نمبر 2

کلیم اللہ خان 12 سال
کرکٹ۔ مطالعہ
77۔ نشتر بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن
لاہور۔

زُہیر اسلام 8 سال
مطالعہ۔ فٹ بال اور کرکٹ
396۔ D سیٹلائٹ ٹاؤن
راولپنڈی۔

وحید احمد 12 سال
مطالعہ کرنا
ظہور بیکری ریلوے روڈ دینہ
ضلع جہلم۔

عمر علی بیگ 12 سال
اچھی کتب کا مُطالعہ
CW-43 نزد محمود محل سینما
اٹک شہر۔

جنید بھنبھرو 15 سال
کرکٹ۔ فٹ بال۔ کراٹے
مکان نمبر 57۔ مسلم ہاؤسنگ سوسائٹی
حیدر آباد۔

مبشر علی زیدی 15 سال
مطالعہ کرنا، کہانیاں لکھنا
آر۔ 20/589 فیڈرل بی
ایریا۔ کراچی۔

شہریار ناگی 12 سال
مطالعہ۔ نعت خوانی
صمدانی منزل۔ تاج کالونی۔
فیصل آباد۔

محمد عدنان حبیب 14 سال
کرکٹ کھیلنا
محمود غزنوی روڈ، توپ خانہ بازار
21/5 سیالکوٹ کینٹ

عامر شہزاد 15 سال
کہانیاں لکھنا
کھوکھر ٹریکٹر ورکشاپ جی ٹی روڈ
موڑ ایمن آباد ضلع گوجرانوالہ

محمد مظہر ہاشمی 14 سال
مطالعہ کرنا
ہاشمی سنٹر محلہ قریشیاں شالیمار
ٹاؤن لاہور-9

احسن 9 سال
تعلیم و تربیت پڑھنا
246۔ سی، گلی نمبر 31،
G/6/2 اسلام آباد

زراعت حسین 14 سال
بیڈمنٹن کھیلنا
معرفت حاجی محمد یعقوب۔ بمقام
بھونڈرنہ، ضلع جہلم۔

محمد علی 12 سال
ٹکٹیں جمع کرنا۔ ہاکی
62 سمن زار۔ 21۔ ایکڑ سکیم
سمن آباد، لاہور۔

عبدالستار 15 سال
مُطالعہ کرنا
محمد وارث ڈسپنسر سالٹ مائن
ہسپتال، کھیوڑہ

آئیے دوست بنائیں

دسمبر 1988

قلمی دوستی کی اس محفل میں شریک ہونے کے لیے یہ کوپن پُر کرنا اور تصویر بھیجنا ضروری ہے۔
(لڑکیاں اس میں حصہ نہیں لے سکتیں۔)

نام ________ عمر ________

مشاغل ________

پتا ________

آپ کا خط مِلا

1۔ ساتھیو اپنی باجی کا سلام لیجیے۔ ماہ دسمبر کے خطوط اور ان کے جواب حاضر ہیں۔ جن ساتھیوں کے خطوط اور تحریریں دیر سے ملے اور جن کے نام ماہ نومبر کے شمارے میں شامل نہ ہو سکے۔ سب سے پہلے اُن ساتھیوں کے نام پڑھ لیں۔ گوجرانوالہ۔ شبانہ عندلیب، محمد شاہد وحید، عطیہ رحمٰن سپرا، عظمیٰ گیلانی سپرا۔ سیالکوٹ وسیم عباس، لبنیٰ رؤوف، نادیہ نواز، وقاص احمد، ظہیر حیدر شاہ۔ ڈیرہ اسمٰعیل خان شمائلہ برلاس، شاہ ارم، نیاز نورین، ساجدہ ذکیہ۔ شورکوٹ۔ عشرت رانی، علی عباس، جھنگ صدر۔ مشتاق انصاری، بمبی۔ پشاور۔ فرحانہ جمیل، رشید درّانی۔ گجرات۔ شمشیر علی خان، مظفر اقبال حاجی والا۔ جہلم۔ زراعت حسین، عظمیٰ ناہید۔ گاؤں شاہ گر ضلع مردان سے گم نام۔ نسرین بانو ٹامیوالی خیرپور۔ فاروق زاہد رحیم یار خان۔ ذوالقرنین حیدر تلہ گنگ۔ عدیل حمید گکھڑ۔ راشد حامد حسین حیدرآباد۔ لبنیٰ شفیع قصور۔ تسنیم الرحمٰن سرگودھا۔ حبیب الحسن اٹک۔ اعجاز احمد پپلاں۔ صائمہ بینا چیچا وطنی۔ عامر شہزاد سمیرا انجم شاہ کوٹ ضلع شیخوپورہ۔ شہزاد رضا کوئٹہ۔ صدف اجمل مری۔ مسرور احمد اسلام آباد۔ ریاض محمود پیرزادہ منڈی بہاؤالدین۔ ظہیر الدین بابر گوجرہ۔ راحیل اختر راولپنڈی۔ سید ناصر حسین لیاقت پور۔ سید آصف رضا کشمور۔ صائمہ گلزار منگلا کینٹ۔ وسیم بن اشرف میاں چنوں۔ محمد خالد نسیم ڈی جی خان۔ ان ساتھیوں نے جگہ کا نام نہیں لکھا۔ علی حماد صفدر۔ تحریم فاطمہ۔ ذیشان انجم۔ یہ تو تھے ساتھیو! سیلاب کے باعث تاخیر سے پہنچنے والے خطوط اور اب کراچی کے افسوس ناک حالات کی وجہ سے جن ساتھیوں کے خط اور اچھی تحریریں ہمیں پرچہ تیار ہو جانے کے بعد ملیں۔ وہ ہیں۔ محمد خرم شہزاد۔ وجیہہ کوکب۔ مسعود عالم برقی۔ زاہد شفیع۔ منصور حسین جانگڑا۔ ثمرہ مرزا۔ فرحین مرزا۔ فاطمہ کلیم۔ صائمہ نسیم۔ ثنا نسیم۔ افشاں انصاری جنید عبدالغفار۔ جویریہ راحت۔ حمیر اسراج۔ محمد رضوان۔ آصف رضا۔ سلیم حسین اور پرنس مقصود قریشی نے اپنے شہر کے حالات پر سلیم کوثر کا ایک شعر لکھا ہے ؎

ادھر اعضا بکھرتے جا رہے ہیں ۔۔۔ اُدھر دشمن کی تیاری بہت ہے

اللہ تعالیٰ تمام مرحومین کی مغفرت فرمائے اور پسماندگان کو صبر عطا فرمائے۔ آمین۔

اب ایک ساتھی خالد محمود شیخ نے کچھ عرصہ پہلے شائع ہونے والی کہانی "پسینے کی بو" کے متعلق۔ جسے وسیم بن اشرف میاں چنوں نے لکھ کر انعام حاصل کیا تھا۔ لکھا ہے کہ یہ کہانی اُن کی ہے "نونہال" کراچی میں شائع ہوئی ہے۔ بتلائیے وسیم بن اشرف آپ سے کیا سلوک کیا جائے؟ ایک اور شکوہ لیبیا سے زوبیہ بانو نے کیا ہے۔ لکھتی ہیں، مجھے شکایت ہے آپ ہمیشہ میرا نام غلط لکھتے ہیں۔ کبھی روبینہ اور زوبینہ میرا نام زوبیہ بانو ZOBIA BANO ہے اس وجہ سے سب میرا مذاق کرتے ہیں۔ اب تو آپ خوش ہیں نا زوبیہ۔

2۔ اور اب آئیے ساتھیو اِس ماہ کے خطوط کی طرف، سب سے پہلا خط ہے عباد علی سحر کا، چوہنگ لاہور سے لکھتے ہیں۔ ماہ نومبر کا شمارہ مِلا اور دل خوشی کے نغمے سُنانے لگا، جیسے کوئی عزیز ایک مدّت کے بعد مِلے یا پھر اچانک کوئی لاٹری نکل آئے، تمام سلسلے اپنی مثال آپ تھے۔ اے حمید کا ناول پُراسرار نقاب پوش اس بار پھر بازی جیت گیا۔ کامک کا سلسلہ جاری رکھیے۔ آپ نے ایک موضوع پر ننھے ادیبوں کو لکھنے کی دعوت دی ہے، یہ بہت اچھا ہے۔ دُوسرا خط ہے کامران حمید لاہور کا، انھوں نے لکھا ہے۔ بادشاہ کی پسند، خونخوار شیرنی، محبت کے پھول، پُراسرار نقاب پوش، فرسٹ ایڈ، ٹائم بم اور خط کی چوری پسند آئیں۔ آپ نے تصویری کہانی بند کر کے اچھا کیا۔ اب اپنی مرضی سے تو لکھ سکیں گے، انعام کی بے حد خوشی ہوئی آپ کا شکریہ۔ وائلڈ لائف میں چڑیوں اور تتلیوں کے بارے میں بھی بتائیے۔ اگلا خط میاں چنوں سے وسیم بن اشرف نے لکھا ہے۔ ایک ہی دن میں تین بار رسالہ پڑھا۔ بظاہر تو کوئی تنقید نظر نہیں آتی مگر آپ یہ الف لیلوی کہانیاں بند کر دیں۔ اور موجودہ دَور کو مدِّ نظر رکھ کے کہانیاں دیں۔ بھیّا وسیم آپ شاید یہ بھول رہے ہیں۔ کہ بڑے بچّوں کے علاوہ چھوٹے بچّے بھی رسالہ پڑھتے ہیں۔ ابتدائی ایک رنگین کہانی انھیں کے لیے ہوتی ہے، فیروزہ لاہور لکھتی ہیں باجی میں صدف عرفان کی حامی ہُوں کہ سال میں ایک شمارہ بچّوں کے نام کر دیں۔ اِس تجویز پر غور کیا جائے گا۔ فیروزہ جی۔ گوجرانوالہ سے عطیہ رحمٰن سپرا لکھتی ہیں۔ نومبر کا شمارہ مِلا تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ داؤدی علمی معمہ کے بجائے سوال جواب کا سلسلہ شروع کریں۔ آپ تاریخ کے عظیم ہیرو کے حالاتِ زندگی دے کر ہماری معلومات میں اضافہ کر رہے ہیں۔ میری باجی ربعیہ سلام کہتی ہے، وعلیکم السلام ربعیہ۔ اور عطیہ جی آپ پہلے اس ماہ کے موضوع پر کہانی بھیجیں۔ دُوسرے موضوعات پر وقت سے پہلے صرف دُور دراز گاؤں کے ساتھی لکھ سکتے ہیں۔ رشیقہ صدیق شیخ لاہور لکھتی ہیں، آج تک بچّوں کے بُہت سے ماہ نامے نظر سے گزرے مگر اِن میں تعلیم و تربیت سب سے زیادہ پسند آیا۔ وسیم عباس سیالکوٹ کینٹ ناراض ہیں لکھتے ہیں، نومبر کا شمارہ دیر سے مِلا مگر سرورق دیکھتے ہی ساری شکایتیں دُور ہو گئیں۔ پورے رسالے میں میرا نام نہیں تھا مگر میں آپ سے شکایت نہیں کروں گا، سارا رسالہ ایک دن میں پڑھ ڈالا۔ بادشاہ کی پسند، خوں خوار شیرنی، پُراسرار نقاب پوش، تین بھوت، خط کی چوری پسند آئیں "محبت کے پھول"

بھیا وسیم اور وہ سب بہن بھائی جنھیں محبت کے پھول اور ناجا سے متعلق شکایت ہے۔ اچھے ساتھیو ہم آپ کی عدالت میں حاضر ہیں۔ وجہ سنیں گے تو ضرور انصاف کریں گے۔ جی ہاں دونوں کہانیاں ہماری ہیں۔ ناجا ہم نے بچوں کے رسالے کو نہیں بھیجی تھی، بلکہ اُن کے ادارے کے ایک ایسے شخص کو دی تھی۔ جو بچوں کی کہانیوں کی کوئی کتاب چھاپ رہے تھے۔ اُس کتاب کا کچھ پتہ نہ چلا تو ہم نے اپنے ذہن میں محفوظ یہ کہانی "محبت کے پھول" کے عنوان سے لکھ دی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اُنھوں نے میری بغیر اجازت اُسے بچوں کے رسالے میں چھاپ دیا تھا۔ شکیلہ حافظ آباد نے لکھا ہے نومبر کا رسالہ بہت پسند آیا۔ خاص کر بادشاہ کی پسند، محبت کے پھول اور تین بھوت۔ باجی آپ مصوری کا مقابلہ دوبارہ شروع کریں۔ اسماعیل عبدالرحمن کراچی لکھتے ہیں، نومبر کا شمارہ ملا۔ سرورق لاجواب تھا۔ ٹیپو سلطان کی تصاویر اچھی تھیں۔ پچھلی بار آپ بھی لکھے ہیں 23 روپے کا انعام ملا شکریہ۔ کتابیں ابھی نہیں ملیں۔ بھیا صبر کریں انعام پہنچنے میں ذرا دیر لگتی ہے۔ فیصل کلیم کراچی نے لکھا ہے۔ آپ نے جس طرح بچوں کو خطوں کے جواب دے کر حوصلہ افزائی کی ہے۔ اس سے مجھے بھی خط لکھنے کا حوصلہ پڑا۔ محبت کے پھول کے مصنف کو مبارکباد، ان کی کہانی مجھے پسند آئی۔ شکریہ بھیا کلیم۔ عاطف خلیق لاہور لکھتے ہیں، اسکولوں سے ملاقات کا سلسلہ بند نہ کریں۔ عبدالغفور شاد ڈنڈوت آر ایس بہت ناراض ہیں لکھتے ہیں۔ میں آپ کا پرانا قاری ہوں۔ مگر اب آپ میرا نام تک شائع کرنا پسند نہیں کرتے۔ کیا رسالے کو تبدیل کرنے کے ساتھ آپ نے پرانے قارئین کو بھی بھلا دیا ہے۔ معمہ حل کرنا جان جوکھوں کا کام ہے، اور بچوں سے اتنے مشکل سوالات ظلم ہے۔ بھیا شاد جو بچے ذہین ہیں وہ یہ معمہ حل کرتے ہیں اور اتنی بڑی تعداد میں کہ مقابلہ مشکل ہو جاتا ہے۔ اب تو آپ کو معلوم ہو گیا نا کہ ہم اپنے پرانے ساتھیوں کو نہیں بھولتے۔ سعدیہ رفیق ورک سیالکوٹ لکھتی ہیں نومبر کے سرورق پر ٹیپو سلطان کی تصویر دیکھ کر بے ساختہ ان کا مشہور قول یاد آ گیا کہ "شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی صد سالہ زندگی سے بہتر ہے"۔ تمام کہانیاں اچھی اور سبق آموز تھیں۔ لاہور سے فرح دیبا کو بھی ڈو صفحے دیکھ کر خوشی ہوئی، لکھتی ہیں، بادشاہ کی پسند، خوں خوار شیرنی، محبت کے پھول، پراسرار نقاب پوش پسند آئے، لطیفے اچھے تھے مگر کئی بار پڑھے ہوئے تھے۔ حیدرآباد کے بارے میں پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ ابن مفرح دل مردان سے لکھتے ہیں ہر طرف ایک ہی نام کا شور ہے۔ کیا ٹی وی اور کیا ہمارے دوست، تعلیم و تربیت کی رٹ لگا رہے ہیں۔ نام سن کر ہم بھی پریشان حال بک سٹال پر پہنچے۔ باجی کی دوائیوں کے پیسوں میں سے گنوا کر رسالہ خرید لائے۔ ڈانٹ الگ کھائی۔ مگر پڑھا تو معلوم ہوا کہ آٹھ روپے گنوائے نہیں بلکہ خزانہ پا لیا آٹھ روپے میں۔ اب یہ خزانہ ہم ہر ماہ اڑاتے رہیں گے۔ شمائلہ برلاس ڈیرہ اسماعیل خاں، عشرت رانی شورکوٹ، پیاری ناراض بہنو! آپ سب چھوٹے شہروں کے رہنے والے ناراض ہونے میں حق بجانب ہو لیکن آپ کا پرچہ ہمیں مقررہ تاریخ پر پریس کو دینا ہوتا ہے تاکہ جلد چھپ سکے۔ ہماری مجبوری ہے لیکن آپ کی خوشی کی خاطر ہم نے ایک ترکیب نکال لی ہے۔ چلیے اب ناراضگی چھوڑیے اور جلدی سے کہانی لکھنا شروع کیجیے۔ سلیم جان مروت، بھیا لطیفے شائستہ قسم کے لکھا کریں یہ بچوں کا رسالہ ہے۔ وسیم بن اشرف میاں چنوں، آپ کا خط دیر سے ملا بھیا۔ فوزیہ رضا کراچی۔ اچھی بہن، آپ کا خط یقیناً لیٹ ملا ہو گا۔ رضوان حیدر بنگیال دریا خان بھیا آپ نے جی بھر کے برا بھلا کہہ لیا۔ ہم ہر ماہ سارے رسالے میں، بلا عنوان، معمہ اور آپ بھی لکھیے کے عنوانات سے تقریباً 124 بچوں کو انعامات دیتے ہیں، تو کیا اتنے بچے ہمارے سفارشی ہوتے ہیں۔ غصے سے پرہیز کریں۔ غصہ عقل کو کھا جاتا ہے۔ داؤدی صاحب جو آپ کے معمے دیکھتے ہیں۔ بہت محنت سے ایک ایک بچے کی تحریر سے ایک ایک لفظ دیکھتے ہیں۔ اور کبھی ناانصافی نہیں کرتے۔ اگر آپ نے پہلے انعام یافتہ ساتھی سے زیادہ الفاظ بنائے ہیں۔ تو ممکن ہے کہ آپ کے زیادہ تر الفاظ بے معنی ہوں۔ اب دیکھیے ماہ ستمبر کی پہلی انعام یافتہ نے 545 الفاظ بھیجے تھے۔ لیکن اُس میں سے درست صرف 448 نکلے۔ اُمید ہے اب آپ کی عقل میں آ گیا ہو گا۔ پرچہ، کوشش کی جا رہی ہے کہ چھوٹے شہروں کو جلد پوسٹ کیا جا سکے۔ بھیا ذیشان بن نذیر فیصل آباد، دھنیش کمار نواب شاہ، محمد قذافی کوہاٹ۔ آپ نے سب چیزیں ملا جلا کر لکھ دیں جب کہ آپ کو ہر بار تاکید کی جاتی ہے کہ الگ الگ صفحے پر لکھیں پھر آپ کہتے ہیں کہ آپ کی کوئی تحریر شائع نہیں ہوتی۔ محمد عثمان خان، آپ نے اپنا پتہ نہیں لکھا بتائیے اگر آپ کا انعام نکل آئے تو کس پتے پر بھیجیں۔ اس طرح بچے انعام سے محروم رہ جاتے ہیں۔ نسرین بانو خیر پور ٹامیوالی۔ کوئی کہانی ایک جگہ سے نقل کر کے دوسری جگہ نہیں بھیجی جا سکتی۔ ہمارے دیے ہوئے موضوعات پر آپ کی سہیلیاں کہانی لکھ سکتی ہیں۔ علی ایاز لاہور کینٹ۔ آپ مایوس نہ ہوں بھیا علی یہ تو بہت اچھی بات ہے، لکھتے رہیں کبھی تو کامیاب ہوں گے۔ راجہ راشد شبیر کراچی۔ صائمہ گلزار منگلا کینٹ۔ پرزوں پر اپنی تحریریں مت بھیجا کریں اور اب خدا حافظ۔ آپ کی باجی

بہاولپور

کوکب کاظمی

ساتھیو، آج ہم آپ کو بہاول پور کی سیر کراتے ہیں۔ بہاول پور آزادی سے قبل برِصغیر پاک و ہند کی ایک ریاست تھی۔ اس ریاست کی بنیاد سترہویں صدی کے شروع میں سندھ کے ایک خاندان داؤد پوتا نے رکھی تھی۔ دو سو سال سے زیادہ عرصے تک اِس ریاست پر عباسی خاندان نے حکومت کی۔ یہ ریاست 1833 میں ایک مُعاہدے کے تحت انگریزوں کے زیرِ نگرانی آئی اور اکتوبر 1947 میں پاکستان میں شامل ہوئی۔ 1955 میں اس کی الگ حیثیت ختم کر کے اسے صوبہ مغربی پاکستان میں شامل کر دیا گیا۔

بہاول پور کے لوگ بڑے سیدھے سادے ہیں۔ مذہب سے گہرا لگاؤ رکھنے کے ساتھ ساتھ اولیاء اللہ سے بھی بہت عقیدت رکھتے ہیں۔ یہاں کے زیادہ تر لوگ عموماً کڑھائی والے رنگین ملبوسات پہننا پسند کرتے ہیں۔ زری کے کام والی جوتی بہاول پور کے علاوہ دیگر شہروں میں بھی بہت پسند کی جاتی ہے۔

پاکستان کے اس قدیم ترین شہر اور اِس کے گرد و نواح میں بیشتر ایسے تاریخی مقامات ہیں جو پُرانے زمانے کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ ان مقامات میں نور محل، دولت خانہ، دربار ہال اور ملک شاہ کا مقبرہ خاص طور پر دیکھنے کے قابل ہیں۔ دیگر قابلِ دید مقامات میں بہاول پور سٹیڈیم، عجائب گھر، سینٹرل لائبریری، اور چڑیا گھر شامل ہیں۔

نور محل: یہ محل اطالوی طرزِ تعمیر کا خوب صورت نمونہ ہے۔ بہاول پور کے حکمران اِسے اپنی رہائش گاہ کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ اب اِس محل میں بہاول پور کے سابق حکمرانوں کی اشیا اور بزرگوں کی نشانیاں رکھی ہوئی ہیں۔ گلزار محل بھی بہاول پور کے حکمرانوں کی رہائش گاہ تھی۔

دربار ہال: جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اس ہال میں دربار لگایا جاتا تھا۔ یہ عمارت بھی اپنے طرزِ تعمیر کے باعث تاریخ میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔

دولت خانہ: سر صادق محمد خان عباسی نے، جو ریاست بہاول پور کے چوتھے حکمران تھے، یہ نیا محل 86 - 1881 میں تعمیر کرایا۔ اِس محل کے ساتھ ہی ایک نہایت دیدہ زیب مسجد اور دِل کش باغ بھی ہے۔

ملک شاہ کا مقبرہ: ملک شاہ اپنے دور کے مانے ہوئے ولی تھے۔ ان کے مزار پر جمعرات کے علاوہ عاشورہ اور عید کے موقع پر عقیدت مندوں کا بہت ہجوم ہوتا ہے۔ یہاں ہر سال عرس بھی ہوتا ہے اور اس موقع پر میلا لگتا ہے۔

عجائب گھر: بہاول پور کا عجائب گھر بھی قابلِ دید ہے۔ یہاں بہاول پور کے سابق حکمرانوں کے دَور کے سکّے، میڈل اور ڈاک کے ٹکٹوں کے علاوہ، لکڑی پر کھدائی کے نمونے، اُونٹ کی کھال پر بنی ہوئی پینٹنگ، دستاویزات، کتبے، خوب صورت کھدائی کے پتھر اور قلمی نسخے رکھے ہوئے ہیں۔

چڑیا گھر: 25 ایکڑ رقبے پر پھیلا ہوا یہ چڑیا گھر ملک کے بہترین تفریحی مقامات میں سے ایک ہے۔ یہاں 120 قسم کے جانور اور 750 کے قریب پرندے رکھے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ قیمتی جانوروں اور پرندوں کو بھی حنوط کر کے رکھا گیا ہے۔

بہاول پور سٹیڈیم: یہ پاکستان کا بہترین سٹیڈیم ہے۔ اس میں ایک کرکٹ گراؤنڈ، دو فٹ بال گراؤنڈ، ایک باسکٹ بال کورٹ اور چھ لان ٹینس کورٹ ہیں۔ ان کے علاوہ ایک سوئمنگ پُول بھی ہے۔ ایک ہاکی سٹیڈیم بھی بنایا گیا ہے جہاں بیک وقت تیرہ ہزار لوگوں کے بیٹھنے کی گنجائش ہے۔

سینٹرل لائبریری: یہ ایک انتہائی دیدہ زیب عمارت ہے۔ اس تاریخی عمارت کا سنگِ بنیاد 8 مارچ 1924 کو سر رفس ڈینیل نے رکھا تھا۔ اُس وقت ریاست کے حکمران نواب سر صادق محمد خاں عباسی پنجم تھے۔ اِس عمارت میں یہ لائبریری 1947 میں قائم کی گئی۔ یہاں قیمتی قلمی نسخے اور لاتعداد کتابیں ہیں۔

بہاول پور شہر میں واقع اِن قابلِ دید مقامات کی سیر تو آپ نے کر لی۔ اب آئیے اُن مقامات کی سیر کو چلتے ہیں جو بہاول پور کے آس پاس واقع ہیں۔ ان میں ڈیرہ نواب صاحب، پتن منارہ اور اُچ شریف کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ آئیے پہلے اُچ شریف چلیں۔

اُچ شریف: اُچ ایک بہت پرانا قصبہ ہے۔ اندازہ ہے کہ اِس قصبے کی بنیاد 500 سال قبل مسیح میں رکھی گئی تھی۔ کچھ لوگ اُچ کو سکندرہ بھی کہتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں دریائے راوی اور دریائے چناب کا سنگم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قصبے کو حسین ترین مقام سمجھا جاتا ہے۔

اُچ شریف کو بے شمار انقلابات دیکھنے پڑے۔ محمود غزنوی کے حملے کے بعد یہ قصبہ مسلمان حکمرانوں کے تحت آگیا۔ یہ بہاول پور سے 75 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے اور مسلمان بزرگوں اور ولیوں کے مزارات

نُور محل

کے باعث اِسے مُقدّس سمجھا جاتا ہے۔ یہاں جو بزرگ دفن ہیں اُن کے نام یہ ہیں: حضرت بہاول حلیم، حضرت جلال الدین سرخ بخاری، مخدوم جہانیاں جہاں گشت، بی بی جیونی اور مخدوم جہانیاں کی بیوی۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا، یہ چھوٹا سا قصبہ تاریخی لحاظ سے بہت اہم ہے۔ یہاں کے مخدوم صاحب (جو اُچ بُخاری کے سجّادہ نشین ہیں) کے پاس اسلامی تبرکات ہیں، جن میں حضرت محمّد صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی دستارِ مُبارک اور چوغہ، حضرت امام حسینؑ کی تلوار، حضرت عبدُالقادر جیلانی کی ٹوپی اور دستار اور حضرت سلمان فارسی کا چوغہ شامل ہیں۔ اِسی طرح مخدوم شمسُ الدین (جو اُچ گیلانی کے سجّادہ نشین ہیں) کے پاس حضورِ پاکؐ کے نقوشِ قدم، حضرت امام حسینؑ کے دستِ مُبارک سے تحریر کردہ قرآن پاک کی چند سُورتیں اور حضرت اویس قرنیؓ کا دانت محفوظ ہے۔

ڈیرہ نواب صاحب: یہاں بہاول پُور کے نوابوں کی رہائش گاہیں ہیں، صادق گڑھ پیلس جو 85-1882 میں تعمیر ہُوا، فنِ تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اِسی طرح مسجد بھونگ بھی فنِ تعمیر میں کوئی جواب نہیں رکھتی۔ اِس مسجد کی سجاوٹ کے لیے سونے کے پتّرے اِستعمال کیے گئے ہیں۔ مسجد پر کی گئی خطّاطی نے اِس کو ایک انوکھا حُسن بخشا ہے۔

پتن منارہ: یہ مینار چار چھوٹے چھوٹے میناروں کے مرکز میں واقع ہے اور کہا جاتا ہے کہ اِسے بُدھ مت کے پیروکاروں نے تعمیر کیا تھا۔

بہاول پُور کے قریب ہی مشہور صحرا چولستان ہے۔ اِس صحرا کا ذکر آپ نے ضرور سُنا ہوگا۔ یہ صحرا 16,000 مُربع کلومیٹر کے رقبے پر پھیلا ہُوا ہے جسے مقامی زبان میں روہی کہا جاتا ہے۔

لفظ چولستان چُولنا سے نکلا ہے جس کے معنی حرکت کرنے کے ہیں۔ چولستان کے لوگ نیم خانہ بدوشی کی زندگی گزارتے ہیں اور پانی اور اپنے جانوروں کے لیے چارے کی تلاش میں اِدھر اُدھر آتے جاتے رہتے ہیں۔ یہاں کے لوگ فنِ دست کاری میں بہت مہارت رکھتے ہیں۔

سمندر اور دریا

سمندر کے پانی میں، دوسری کیمیائی اشیا کے علاوہ، نمک بھی ہوتا ہے۔ اسی لیے اس کا پانی نمکین ہوتا ہے۔ دریا کا پانی نمکین نہیں ہوتا۔ اسے "تازہ پانی" کہتے ہیں۔ تمام دریا، ہزاروں میل کا سفر طے کر کے، آخر کار سمندروں میں گر جاتے ہیں۔ وہ اپنے ساتھ زمین پر واقع چٹانوں میں سے نمک کی کافی مقدار بہا کر لاتے ہیں، جو سمندر کے پانی میں مل جاتا ہے۔ یہ عمل لاکھوں سال سے ہو رہا ہے۔

مختلف سمندروں میں نمک کی مقدار مختلف ہوتی ہے۔ بحیرۂ بالٹک کا پانی کم نمکین ہے، کیوں کہ اس سمندر میں بہت سے دریاؤں کا پانی شامل ہوتا رہتا ہے۔ بحیرۂ مُردار (DEAD SEA) کا پانی بہت نمکین ہے۔ کیوں کہ اس سمندر میں بہت کم دریا گرتے ہیں۔ اوسطاً ہر سمندر کے ایک لٹر پانی میں 36 گرام نمک ہوتا ہے۔ جن ملکوں میں نمک کی کانیں نہیں ہیں یا بہت کم ہیں، وہاں سمندر کا پانی خشک کر کے نمک حاصل کیا جاتا ہے۔ اس کا ذائقہ کچھ کڑوا ہوتا ہے، کیوں کہ اس میں دوسری کیمیائی اشیا ملی ہوتی ہیں۔ پاکستان میں کھیوڑہ کے مقام پر نمک کی کانیں ہیں اور ہم انھی کانوں کا نمک استعمال کرتے ہیں۔

چاند کی کشش سے اکثر سمندروں کا پانی، 25 گھنٹوں میں، دو دفعہ اُوپر اُٹھتا اور نیچے گرتا ہے۔ اسے مدّ و جزر کہتے ہیں (مد: چڑھاؤ۔ جزر: اُتار)۔ سمندر کا جو حصہ چاند کے سامنے آتا ہے، چاند اُسے اپنی طرف کھینچتا ہے اور سمندر کا پانی اُوپر کو اُٹھ جاتا ہے۔ اسی طرح چڑھاؤ اُتار ہوتا رہتا ہے۔ کھلے سمندر میں پانی کی موجیں ایک میٹر تک بلند ہوتی ہیں، مگر ساحل پر، جہاں گہرائی کم ہوتی ہے، ان کی اُونچائی دس میٹر تک پہنچ جاتی ہے۔ مدّ و جزر کو اردو میں جوار بھاٹا بھی کہتے ہیں۔

جب ہوا چلتی ہے تو سمندر کی سطح پر لہریں اُٹھتی ہیں (کسی پیالے میں پانی بھر کر پھونک ماریے۔ اس میں لہریں اُٹھنے لگیں گی)۔ ان کے علاوہ سمندروں میں ایک اور قسم کی لہریں یا موجیں بھی اُٹھتی ہیں، جنھیں مدّ و جزر کی لہریں (TIDAL WAVES) کہتے ہیں۔ لیکن ان موجوں کا مدّ و جزر سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

یہ اُونچی اُونچی موجیں سمندر کے نیچے یا اُس کے قریب زمین کے چھلکے کی حرکت کی وجہ سے اُٹھتی ہیں۔ بعض وقت شدید آندھی سے بھی اِس قِسم کی موجیں پیدا ہوتی ہیں۔ اِن کی رفتار بہت تیز ہوتی ہے۔ اور یہ بعض وقت 800 کلومیٹر فی گھنٹے کی رفتار سے ساحل کی طرف بڑھتی ہیں۔ اِن بھیانک موجوں سے سمندری جہاز غرق ہوجاتے ہیں اور ساحل پر آباد بستیاں تباہ ہوجاتی ہیں۔

دریا عموماً اُن پہاڑوں یا پہاڑیوں سے نکلتے ہیں جہاں بہت زیادہ بارش ہوتی ہے۔ اِس جگہ کو دریا کا منبع کہتے ہیں۔ دریا بہتا ہُوا سمندر کی طرف بڑھتا ہے تو راستے میں بہت سے ندی نالوں کا پانی اُس میں شامِل ہوجاتا ہے۔ اِن ندی نالوں کو مُعاون دریا کہتے ہیں۔ یہ سب ندی نالے دریا میں مِل کر سمندر میں گرجاتے ہیں اور یہ جگہ دریا کا دہانہ کہلاتی ہے۔

دریا کے تین حِصّے ہوتے ہیں۔ جہاں سے یہ نکلتا ہے وہ حِصّہ اُس کا بچپن کہلاتا ہے۔ یہاں اِس کی شکل ایک پتلی سی نالی جیسی ہوتی ہے، مگر رفتار بہت تیز ہوتی ہے۔ جب یہ کُھلے میدان میں داخل ہوتا ہے تو اِس کا پاٹ بڑھ جاتا ہے۔ اِسے دریا کی جوانی کہتے ہیں۔ پھر یہ جُوں جُوں آگے بڑھتا جاتا ہے، چوڑائی اور گہرائی بڑھتی جاتی ہے جس سے اِس کی رفتار سُست ہوجاتی ہے۔ دریا کا یہ حِصّہ اُس کا بُڑھاپا کہلاتا ہے۔

جب کبھی دریا کے راستے میں سخت اور نرم چٹانیں آجاتی ہیں تو وہ اُن کے اُوپر سے اُچھل کر دُوسری طرف گرتا ہے۔ پانی کے زور سے نرم چٹانیں گِھس کر ٹُوٹ پھُوٹ جاتی ہیں اور یہ جگہ نیچی ہوجاتی ہے۔ اِسے آب شار کہتے ہیں۔ جُوں جُوں یہ جگہ نیچی ہوتی جاتی ہے، آب شار کی بلندی بڑھتی جاتی ہے آب شار بجلی پیدا کرنے کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اِس سے بجلی کے جنریٹر چلائے جاتے ہیں۔ جن مُلکوں میں قُدرتی آب شاریں نہیں ہیں، وہاں دریاؤں پر بند باندھ کر مصنوعی آب شاریں بنائی گئی ہیں، جن سے بجلی پیدا کی جاتی ہے۔

دُنیا کی کوئی چیز فنا نہیں ہوتی، اُس کی شکل بدل جاتی ہے۔ پانی بھی فنا (ضائع) نہیں ہوتا۔ اِسے ہماری زمین کی فضا زمین کی حُدود سے باہر نہیں نکلنے دیتی۔ ہاں البتہ یہ اپنی شکل بدل لیتا ہے اور خشکی، سمندر اور ہوا کے درمیان مُسلسل سفر کرتا رہتا ہے۔

سمندروں، جھیلوں اور دریاؤں کا پانی سورج کی گرمی سے گیس بن کر اُڑتا رہتا ہے۔ اِس گیس کو آبی بُخارات کہتے ہیں۔ آبی بُخارات اُوپر کی ٹھنڈی ہوا میں شامِل ہو کر ٹھنڈے ہوجاتے ہیں اور پانی کے ننھے ننھے قطروں کی شکل اختیار کرلیتے ہیں۔ پانی کے یہی بے شمار قطرے مِل کر بادل بنتے ہیں اور بادل اِن قطروں کو واپس سمندروں، دریاؤں، جھیلوں اور خشکی پر برسا دیتا ہے۔ اگر موسم بہت ٹھنڈا ہو تو پانی کے یہ قطرے جم کر برف بن جاتے ہیں اور دُھنکی ہُوئی رُوئی کی طرح نیچے گرتے ہیں۔ اِسے برف باری کہتے ہیں۔ اِس طرح جو پانی سمندروں، دریاؤں، جھیلوں (بلکہ پودوں، حیوانوں اور انسانوں کے جسموں سے) بُخارات بن کر اُوپر گیا تھا، وہ بارش اور برف کی صُورت میں واپس آجاتا ہے۔ اِسے "پانی کا چکّر" کہتے ہیں۔ (س۔ل)

کھُلا میدان
ٹیپو چند دُوسرے بچّوں کے ساتھ
کھیل رہا ہے

ٹیپو ! ٹیپو !! دیکھ تو وہ سامنے ایک باریش
بزرگ ہماری طرف چلے آ رہے ہیں یوں معلوم ہوتا ہے
جیسے وہ تم سے کوئی بات کرنا چاہتے ہُوں۔

السلام علیکم جناب !
وعلیکم السلام
جیتے رہو بیٹا

تمھارے لیے ایک خوشخبری لایا ہوں۔ بیٹے !
اللہ کے فضل سے تم ایک دِن اس ریاست کے
حکمران بنو گے ! وعدہ کرو کہ عین اِس جگہ
ایک شاندار مسجد بنواؤ گے۔
(ٹیپو نے بزرگ کو یقین دلایا کہ ویسے ہی ہوگا انشاء اللہ)

اللہ کا لاکھ لاکھ شُکر ہے
ٹیپو بیٹا مَاشَآءَ اللہ
خوب اچّھا پروان چڑھ رہا ہے۔
میرا چاند مَاشَآءَ اللہ
گیارہویں سال میں داخل ہو چُکا ہے

مجھے تو ٹیپو بیٹا کوئی با برکت ہستی دکھائی دینے لگا ہے۔ اِس کی پیدائش کے فوراً بعد ہی مُجھے مسلسل ترقی دی جا رہی ہے۔ دیکھ لو کتنی جلدی سپہ سار کے عُہدے پر جا پہنچا ہُوں
اس کم عمری ہی میں ٹیپو بیٹا فنون سپہ گری میں بھی تاک ہوتا چلا جا رہا ہے۔ نشانہ بازی، گھڑسواری اور پیراکی میں بھی اُس نے خاصی مہارت حاصل کر لی ہے۔ لطف یہ ہے کہ ان سب دلچسپیوں کے باوجود کتابوں میں اس کا شوق بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔ اپنی لیاقت اور نیکی کی وجہ سے ساری ریاست میں بے حد مقبول ہے نیت صاف ہو تو اللہ سب کچھ دے دیتا ہے۔

ارے بھئی علی ! کیا مزے کی خبر ہے !
بھئی رام لال ! کچھ ہمیں بھی تو پتہ چلے !
یار! یہ تو تمھیں پتہ ہی ہے نا کہ ہمارا راجہ بہت آوارہ مزاج اور عیاش آدمی ہے۔
ہاں بھئی یہ بات کسے معلوم نہیں۔ اُس کم بخت کو اپنی داشتاؤں سے فُرصت نہیں۔
سپہ سالار حیدر علی بے حد با اخلاق اور بڑے ہر دلعزیز افسر ہیں لوگوں میں ان کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے خار کھاکر راجہ نے انھیں معزول کر دینے کا فیصلہ کرلیا تھا، مگر بھگوان کی کرپا سے حیدر علی کو اس گندی سازش کا پہلے ہی پتہ چل گیا۔ انھوں نے اُس کم بخت راجہ کو تخت سے اُتار پھینکا اور خود حُکمران بن گئے۔
اب کیا ہوگا ؟
ہو گا کیا! دیکھتے نہیں لوگ خوشیاں منا رہے ہیں کیوں نہ ہو اُنھیں عرصہ بعد ایک نیک، ذہین اور ہر دلعزیز حکمران میسر آیا ہے۔ اب دیکھنا یار ریاست میں ترقی اور خوشحالی کا دَور دَورہ ہوگا۔
سُلطان حیدر علی کی جے !
سُلطان حیدؔر علی زندہ باد!
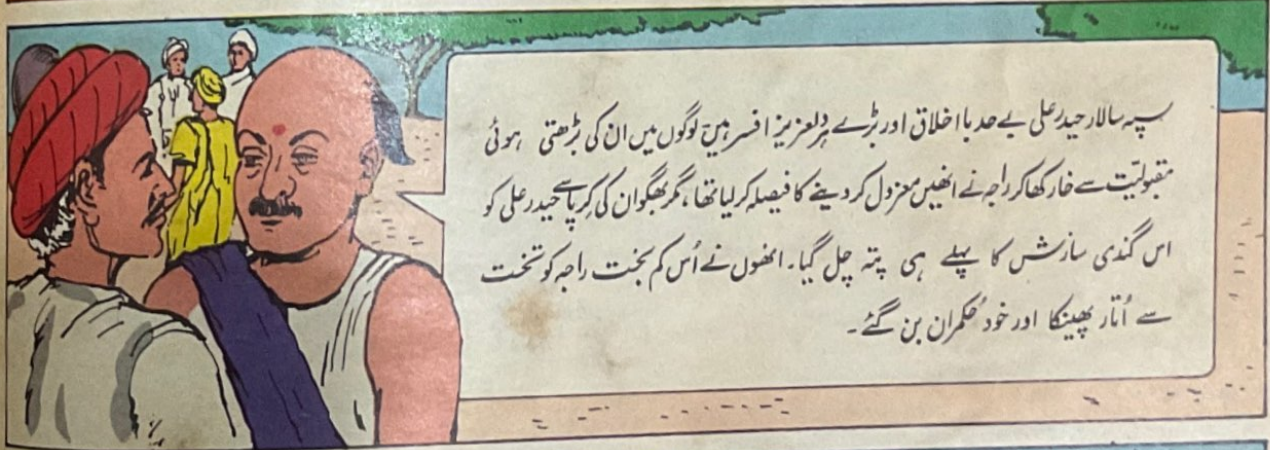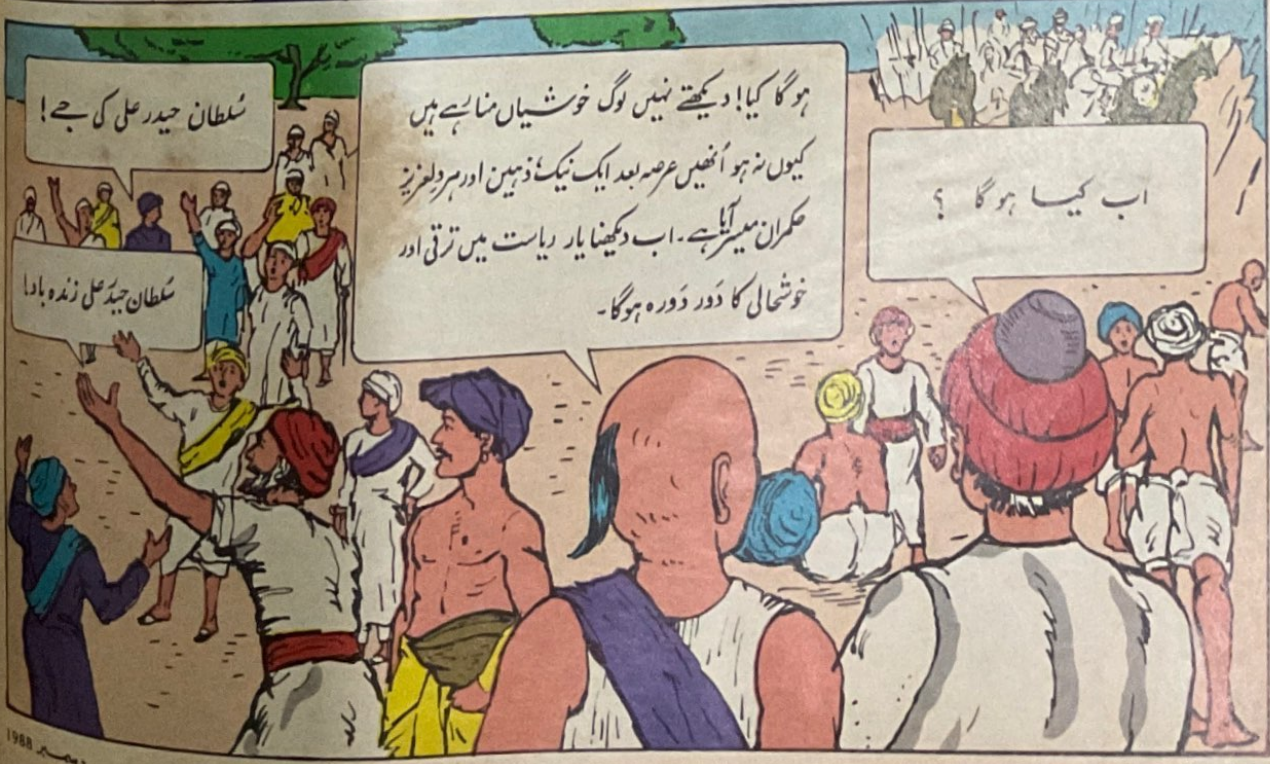
شہزادہ ٹیپو کم سنی ہی میں تلواروں کی جھنکار سے جرأت اور اخلاق کی نت نئی داستانیں لکھنے میں ہمہ تن مصروف ہے۔

فوجی افسر قبائلی ہندو عورت کی طرف لپک رہا ہے۔

افسر ہندو عورت کو گھسیٹے لیے جا رہا ہے۔

شہزادہ ٹیپو بد اخلاق افسر کو گولی کا نشانہ بنا رہا ہے۔

ارے یار! غضب ہو گیا۔ ہمارے پیارے سلطان حیدر علی عین اس وقت انتقال کر گئے ہیں، جب ان کا دلیر ولی عہد شہزادہ ٹیپو میدان جنگ میں دشمنوں سے برسرِ پیکار ہے۔ ابھی کچھ عرصہ ہی ہوا، اُس نے ریاست کرگ کے علاقہ بھالم کے ہندو قبائلی سردار کو شکست فاش دی تھی

ہاں بھئی! سلطان کی بے وقت موت کا کس کو صدمہ نہیں ہُوا، مگر دیکھ لو ہونہار بیٹا عظیم باپ کے نقش قدم پر چل رہا ہے۔ اس فوجی کارروائی کے دوران فاتح شہزادے کا ایک بڑا افسر اُن ہندو قبائلیوں کی ایک خوبصورت عورت کو زیادتی کی نیت سے گھسیٹے لیے جا رہا تھا۔ شہزادے نے فوراً گولی مار کر افسر کو وہیں ڈھیر کر دیا۔

نِیل گائے

یہ بھارت اور پاکستان کے کم گھنے جنگلوں میں پائی جاتی ہے۔ چھانگا مانگا کے جنگل اور لال سوہنرا نیشنل پارک کے جنگل میں ملتی ہے۔ رات کو فصلوں میں چرتی ہے۔ جب یہ آپس میں لڑتی ہیں تو گردنوں کے ساتھ گردنیں لگا کر ایک دوسرے کو سر جھٹک کر چوٹ لگاتی ہیں۔ نر اکثر اپنی گردن آگے کو کیے، ٹھوڑی زمین کے مُتوازی لا کر، دوسرے نر کی طرف اُسے ڈرانے یا اُس پر غالب آنے کے لیے بڑھتا ہے۔ اگر دُوسرا نر بھی تیار ہو تو ایک دوسرے کو سینگ بھی مارتے ہیں۔

نِیل گائے دوسرے یا تیسرے دن پانی پیتی ہے۔ ایک جھول میں ایک بچہ دیتی ہے، جو تقریباً دس دِن لمبی گھاس میں چھُپ کر لیٹا رہتا ہے۔ صرف دُودھ پینے کے لیے کھڑا ہوتا ہے۔ اِس کے بعد یہ ماں کے ساتھ پھرتا ہے۔ جنگلی نیل گائے تقریباً پندرہ سال اور پالتو اکیس سال تک زندہ رہتی ہے۔

نیل گائے ناپید ہو رہی ہے، اِس لیے حکومت نے اِس کے شکار پر پابندی لگا دی ہے۔

جنگلی حیات قومی ورثہ ہے

The Taleem-o-Tarbiat, Lahore
L NO. 4756 PAKISTAN'S MOST WIDELY READ URDU MAGAZINE FOR CHILDREN OF ALL AGES Price Rs. 8.0

میری پہلی تصویری اٹلس